عالمی
سیاست
میں
جمہوریت
لیسٹر بی۔ پیرسن

# عالمی سیاست میں جمہوریت

مصنف

لیسٹر بی۔ پیئرسن

سابق وزیر خارجہ کنیڈا


مترجم

گوپال متل


ناشر

نیشنل اکاڈمی۔ ۹، انصاری مارکٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

دوسرا ایڈیشن

تعداد ۳۰۰۰

قیمت ۵۰ نئے پیسے

# عرضِ ناشر

لیسٹر بی پیرسن کی یہ کتاب جس کے اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جہاں ایک طرف دور رس آدرش واد کی آئینہ دار ہے وہاں دوسری طرف بالغ نظرانہ حقائق پسندی کا مظہر بھی ہے۔

مسٹر پیرسن کینیڈا کے سابق وزیر خارجہ ہیں اور اتحادی سبھا کے سابق صدر۔ اتحادی سبھا کا چارٹر تیار کرنے کے لئے جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں شامل ہونے والے کینیڈا کے وفد کے وہ مشیر بھی تھے۔ بین الاقوامی سیاست میں ان کے تجربے اور اُن کی بالغ نظری کو مسلمات کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان مسائل پر بحث کی ہے جن کا جمہوریت کو دُنیا بھر میں سامنا ہو رہا ہے۔ انھوں نے نعرے بازی اور سطحی استدلال دونوں سے گریز کیا ہے اور مختلف مسائل پر خالص علمی اور ماہرانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔



مسٹر پیرسن ان مشکلات کے ہرگز منکر نہیں جن کا جمہوری ملکوں کو سامنا ہو رہا ہے لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں کہ جمہوریت موجودہ مسائل کو حل کرنے کی اہل نہیں۔ انھوں نے موجودہ حالات کا ماضی کے حالات سے موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ بہت سے مسائل جنھیں بسا اوقات ناقابلِ حل سمجھ لیا جاتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنے انوکھے ہرگز نہیں۔ نوعِ بشر نے پہلے بھی ان کا مقابلہ کیا ہے اور اب بھی ان کا مقابلہ کرنے کی اہل ہے۔ مسٹر پیرسن ایک کامیاب سیاستداں ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ مؤرخ بھی ہیں۔ اس بات نے ان کے طرزِ استدلال کی جامعیت [illegible] اضافہ کیا ہے

کتاب کی افادیت میں ان کے تاریخی علم اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بصیرت کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ جبرِ تاریخ کے نظریئے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ انسان تقدیر کا غلام یا اس کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ ان کے نزدیک جبرِ تاریخ کے نظریہ کو قبول کرنا "اخلاقی پشت پناہیوں سے محروم" ہونے کی علامت ہے۔ ان کے یہ الفاظ جمہوریت کیشوں کو نیا عزم عطا کر سکتے ہیں کہ "جو چیز زندگی، تاریخ اور سیاست کو حقیقی اہمیت عطا کرتی ہے وہ انسانوں اور قوموں کی یہ قدرت ہے کہ وہ صرف اپنے ماحول کا تتبع نہیں کرتے بلکہ مثبت عمل کے بھی اہل ہیں" اور یہ کہ "آدمی اور اس کا ذہن صرف ماحول اور وراثت کی پیداوار نہیں اور اس کے لئے روح کی غیر محدود دنیا سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہے"۔ یہ الفاظ ہر جمہوریت کیش کا جزوِ ایمان بننے کے مستحق ہیں اور اگر واقعی ایسا ہو جائے تو جمہوریت کے راستے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہو سکتی۔ اُن کے یہ الفاظ بھی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ کسی قوم کے "حقیقی مفاد کا فیصلہ کرنے کے لئے سیاسی بصیرت سے کہیں زیادہ اخلاقی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے"۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو پبلک نے اس کا خیر مقدم فراخ دلی سے کیا۔ اسے اور زیادہ مقبول اور عوام رس بنانے کے لئے دوسرے ایڈیشن کی قیمت ایک روپیہ پچیس نئے پیسے کی بجائے صرف پچاس نئے پیسے کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بھی زیادہ مقبول ہوگا۔

# فہرست

# دیباچہ

سنہ ۱۹۵۵ء میں جو ایک طرف سرفرازی کا سال ہے اور دوسری طرف گہری تشویش کا، سٹانفورڈ ٹسل تقریروں کی دعوت پاکر میں نے بڑا فخر محسوس کیا اور اس سے متاثر بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ میرے متاثر ہونے کی وجہ وہ نتیجہ تھا جو میں نے اس دعوت سے اخذ کیا۔ وہ نتیجہ یہ تھا، کہ میں عالموں کی صف میں شامل ہونے کا تھوڑا بہت حق اب بھی رکھتا ہوں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو عملی سیاست میں مصروف ہو یہ بات بہت خوشگوار ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے پیشے کا کوئی عذر پیش کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اپنے پیشے پر ناز ہے جو اس شہرت سے جو اسے اس وقت حاصل ہے کہیں زیادہ شہرت کا مستحق ہے۔ اگرچہ مجھے یہ اعتراف بھی ہے کہ جس عزت کا وہ اب مستحق ہے اس سے کہیں زیادہ کا وہ اپنے آپ کو اہل بھی ثابت کر سکتا ہے۔ آج اگر اس پیشے کی شہرت نسبتاً کم ہے تو اس کی وجہ کسی حد تک ان بہتانوں پر بھی ہے جو اس پر اُن لوگوں کی طرف سے لگا دیئے جاتے ہیں جن کے نزدیک اپنی عدم شرکت کا جواز پیش کرنے کے لئے اس قسم کی نکتہ چینی ضروری ہوتی ہے۔

چند سال تک میں ایک مؤرخ رہا ہوں۔ میرے علمی آلات اس وقت تک زنگ آلود ضرور ہوگئے ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ پہلے کی طرح اب بھی غیر مبہم طور پر قائم ہے کہ اگر موجودہ آراء اور مروجہ تعصبات کو ہمارے ذہنوں پر بے رحمانہ قوت کے ساتھ غالب نہیں آنا تو ہمیں اُن پر تاریخی علم، تاریخی تجربے اور اُن صداقتوں کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے جنھیں اس قسم کے

متخیلانہ طور پر کچھ دیر کے لئے کسی اور دور میں پہنچ جائیں۔ یہ بات اچھی بھی ہے کہ ہم کام کے
زور اور مضطربانہ بھاگ دوڑ سے کچھ دیر کے لئے نجات حاصل کر کے انسان کے ذہن اور روح
کی ان عظیم تخلیقوں سے اپنا تعارف تازہ کر لیں جن کا ماحول آزاد ہے اور جہاں ان وسائل کا
جو خود انسان کے اندر موجود ہیں صحیح احساس کیا جا سکتا ہے۔

مجھے شبہ ہے کہ علمیت اور ذہنی تفتیش کے ماحول میں واپس آکر جو اطمینان، جو آسودگی
مجھے ہوتی ہے اس میں وہ اربابِ علم بھی شریک ہو سکتے ہیں جنھیں سیاست کے میدان اور دھندلے
ماحول میں جا نکلنے کا الٹا تجربہ ہوا ہے۔ سیاست اور سیاسئین کا تجربہ ان لوگوں کو اکثر خوف زدہ
کر دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہزاروں سال سے خوف زدہ کرتا آیا ہے، جن کا اپنے مسائل کے متعلق
رویہ سکون اور ہوشمندی کا آئینہ دار ہوتا ہے جو تعقل آشنائی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

پروفیسر بریبنر نے جو کسی زمانے میں ٹورنٹو یونیورسٹی میں میرے ساتھی تھے، سیاسئین
کی سرگرمیوں پر اہلِ علم کے اضطراب کو اپنی ایک تقریر میں بہت لطیف لیکن قابلِ فہم اصطلاحوں
میں بیان کیا ہے۔ اس تقریر کا موضوع، جو انھوں نے نومبر سنہ ۱۹۵۴ء میں کولمبیا یونیورسٹی کے
پچاسویں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر کی تھی، حِلم تھا (ایک ایسا موضوع جو سبھی کے لئے مفید
ہے اور پبلک کے خدام کے لئے خصوصی طور پر) انھوں نے کہا تھا "یہ جسمانی قوت، سماجی قوت،
اقتصادی قوت اور پروپیگنڈائی قوت کا اجتماع ہے جسے بطور انعام حاصل کرنے کے لئے سیاسی
قوت کے ماہر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور اہلِ علم کے طبقے کو سب سے زیادہ خوف زدہ
یہی چیز کرتی ہے۔ سیاست فوری مقاصد کے حصول کا آرٹ ہے اور ایسا سیاسی تدبر جس کی بنیاد
دور رس اور عمیق تصورات پر ہو بہت کمیاب ہے؟

ان لیکچروں میں میں چونکہ دور رس اور گہرے مطالعے کی کوشش کروں گا اس لئے پرنسٹن
میں موجودگی سے مجھے جو خوشی محسوس ہو رہی ہے وہ تشویش سے مبرا نہیں۔ مبادا میں اس تقریب

کر چکے ہیں موزوں جانشیں ثابت نہ ہو سکوں۔

میں پچھلے دنوں ان تقریروں کی فہرست پر جو مجھ سے پہلے کی جا چکی ہیں نظر ڈالتا رہا ہوں۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ صرف اُن لوگوں کے نام نہیں تھے جو بہر اعتبار حقیقی امتیاز کے مالک تھے بلکہ ان موضوعات کی بے تعصبانہ اور دُور رس رنگا رنگی تھی جن سے انھوں نے بحث کی تھی۔

مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر میں اولیور سینٹ جان گوگارٹی کو "حیرت انگیز ثقافت" یا لن یو ٹانگ کو "معقول پسند سرشت" کے موضوع پر تقریر کرتے سُن سکتا۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے آس پاس اس موضوع کا انتخاب واقعی معقول پسندانہ تھا کیونکہ اس کے آئندہ سال لوگوں کو ماسکو کے ایک پروفیسر کی تقریر سُننے کا موقع ملا۔ اسی سال ایک اور اہم تقریر بھی ہوئی تھی جو ولیم بیب نے کی تھی۔ اس کا عنوان مجھے اس احساس کی یاد دلا دیتا ہے جس سے میں کبھی کبھی کسی بین الاقوامی مسئلے کے ساتھ اُلجھتے ہوئے دوچار ہو جاتا ہوں۔ یہ عنوان تھا "تہ در تہ گہرائی میں"۔

تقریروں کے اس سلسلے میں پندرہ یا بیس سال پہلے چند اور اہم موضوع بھی زیر بحث آئے تھے جو ہمارے مسائل کے تسلسل اور ہماری مصروفیتوں کے پے درپے ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً "عرب قوم پرستی کی وسعت پذیری"، "دُور مشرق کا بحران"، "سائنس کے سماجی مفاہیم"، "کانگریس اور خارجہ پالیسی"۔ ان تمام عنوانوں میں دَورِ حاضرہ کی گونج موجود ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں مسٹر جان فوسٹر ڈلیس نے بھی "قوموں کے سماج کے اندر پُرامن تبدیلی" کے موضوع پر ایک اہم تقریر کی تھی جسے میں لازمی طور پر پڑھوں گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے عالمی سیاست میں جمہوریت کے متعلق گفتگو کرنا ہے یہ ایک ہمہ گیر عنوان ہے جس میں پھیلنے کی کافی گنجائش ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے ضرورت سے زیادہ دلچسپی ہوئی کہ مسٹر ہنری سٹمسن اور اس سلسلہ تقاریر کے آٹھ دوسرے مقرر جمہوریت کے مختلف

ہے اور پیچیدہ بھی۔ اس کے باوجود اس کا ذکر کرتے ہوئے آدمی اب ہچکچاتا ہے۔ جب سے اس لفظ کو ان آمریت کیشوں نے استعمال کرنا شروع کیا ہے جو اس کے حقیقی معنیٰ سے غداری کے مرتکب ہیں، اس وقت سے اس سکّے کے کھرے پن میں بہت فرق آ گیا ہے۔ جب وہ اس لفظ کے آگے "عوامی" کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں تو اس توہین میں کسک بھی شامل ہو جاتی ہے۔

مجھے جمہوریت کی ایسی کوئی تعریف نہ تو مل سکی ہے اور نہ میں وضع کر سکا ہوں جو مجھے مطمئن کر دے۔ تعریفیں میں نے بہت سُنی ہیں اور پڑھی بھی ہیں لیکن وہ مطمئن مطلق نہیں کر سکیں، ان میں کچھ تعریفیں تو نعرے کا انداز لئے ہوئے ہیں اور کچھ سطحی استہمام کا۔

جمہوریت کی تعریف چاہے کچھ بھی ہو، ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کا حقیقی مفہوم محسوس ضرور کرتے ہیں خواہ ہم اس کا اظہار نہ کر سکیں۔ سماجی اور سیاسی ترقی کے لئے یہ کتنی ہی مفید ہو لیکن اس کی قوت اور صحت کا انحصار ایماندارانہ اور ہوشمندانہ انفرادی فیصلے اور عمل پر ہے۔ یہ چیز آج کی دُنیا میں جس میں ہم رہتے ہیں آسان نہیں۔ یہاں ہر طرف سے آنے والی آوازوں کا انتشار اپنا اثر ڈالتا رہتا ہے اور اسی انتشار کو بسا اوقات غلطی سے جمہوریت سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کام آسان ہو یا مشکل، جمہوریت کو قوی رکھنا ضرور پڑے گا اور اس کی قوت ایسی ہونی چاہیے جو صرف فوجی اور اقتصادی نہ ہو بلکہ ذہنی اور اخلاقی بھی ہو۔

لیسٹر۔ بی۔ پیرسن

اڈاوہ

۷ مئی سنہ ۱۹۵۵ء

## پہلا باب

# پرانے مسائل کی نئی شکل

گذشتہ پچاس سال میں لبرل اور نیابتی جمہوریت کو شدید خطروں کا سامنا ہوا ہے اور کئی بار تو یہ خطرے مہلک نظر آتے تھے۔ یہ سوچنا بلاوجہ نہیں کہ جو مشکلات ہمارے سامنے ہیں وہ اتنی ہی شدید ہوں جن کا ہم نے اس صدی کے نصف اوّل میں مقابلہ کیا جسے سر ونسٹن چرچل نے "خوفناک بیسویں صدی" کا نام دیا ہے۔

بیشتر نئی مشکلوں کا امتیازی پہلو البتہ صرف اس قدر ہے کہ وہ نسبتاً قوی الجثہ شکل میں ہمارے سامنے آئی ہیں، یہ زیادہ تر پرانے ہی مسائل ہیں جو اب نمایاں تر ہو گئے ہیں۔

موجودہ مسائل کی جسامت کے پیش نظر یہ گمان گذر سکتا ہے کہ ان پر قابو پانا ممکن نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ واقعتاً ایسا ہی ہو۔ صرف بین الاقوامی سیاست میں ہی نہیں بلکہ موسیقی اور بہت سے دیگر فنون اور ریاضی اور انجینیرنگ میں بھی صرف پیمانے کو اوّلیت حاصل نہیں ہوتی، اور بسا اوقات اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ بنیادی امور کا تعلق اقدار سے ہوتا ہے مقدار سے نہیں، مقدار بذاتِ خود اضافی شے ہے۔ جسامت میں اضافے کے باوجود اگر نئے مسائل کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے عناصر ایسے نہیں جن سے ہم آشنا نہ ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ان کے تقاضے نسبتہً مشکل ہیں لہٰذا صرف جسامت سے خوفزدہ ہونا حماقت ہے۔ اگرچہ بسا اوقات مقدار کی تبدیلیاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کی بدولت ایک بالکل نئی چیز سامنے آجاتی ہے۔

کی بقا بھی خطرے میں پڑی ہوئی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ مسئلے نئے نہیں۔ انسانوں نے ان مسائل کا پہلے بھی مقابلہ کیا ہے، اگرچہ یہ بات بحث طلب ضرور ہے کہ یہ خیال کہاں تک تسلّی کا باعث ہو سکتا ہے۔ انسانوں نے ان مسائل کو ایک سے زائد بار کامیابی کے ساتھ حل کیا ہے' اگرچہ کئی بار انھیں ناکامی بھی ہوئی ہے۔ ناکامی یا شدید غلطی کی پاداش البتّہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے' نوعِ بشر اب غلطیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ہماری موجودہ مشکلات اور خطرے بہت بڑی حد تک ہماری سابقہ ناکامیوں کا نتیجہ ہیں لیکن اس کے برعکس ایسی مشکلیں بھی ہیں جن کا تعلّق بہت بڑی حد تک ہماری کامیابیوں کے ساتھ ہے۔ بالخصوص اُن کامیابیوں کے ساتھ جو ہم نے قدرتی سائنس اور صنعتی علوم کے میدان میں حاصل کیں۔



سماج ہو یا فرد' زندگی کا ایک اہم خاصّہ یہ بھی ہے کہ مشکلوں پر عبور پانے کے نتیجے کے طور پر زیادہ بڑی مشکلوں کا مقابلہ کرنے اور اُن پر عبور پانے کی ذمّہ داری کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ ہم ایک ایسی پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں جو بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔

اگر ہم اپنے گذشتہ تجربات کے مفہوم اور اُن کی نوعیت کو جانچ کر اُن کے متعلق کوئی معیار مقرر کر لیں تو اپنے مقصد تک رسائی آسان ہو جائے گی۔ اس صورت میں ہم کامیابی کے ساتھ چوٹی کو سر کر سکیں گے۔ مقررہ معیار کی مدد سے ہم پیش آنے والے مشکل حالات کا اندازہ لگا سکیں گے اور صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں گے جس پر کامیابی اور ناکامی کا بڑی حد تک انحصار ہے۔

میرے نزدیک مغربی تہذیب کی ساری تاریخ میں دو باتوں کو معیار کا درجہ حاصل رہا ہے۔

پہلا معیاری اصول یہ ہے کہ ہر اُمنگ اور ہر عمل کا مرکز فردِ انسانی ہے۔ ایک یونانی فلسفی فیثاغورث نے آج سے تقریباً ۲۴۰۰ سال پہلے یہ حکیمانہ بات کہی تھی کہ "ہر چیز کا پیمانہ آدمی ہے" اگرچہ یہ ایک دعوے کو بمنزلۂ ثبوت مان لینا ہے لیکن فیثاغورث کا دعویٰ اپنے طور پر صحیح ضرور ہے' اور اس نے تاریخ میں ایک عظیم نجات آفریں جذبے اور بصیرت کا کام دیا ہے۔ یونانی فلسفے اور

[illegible]

کی تحریکوں اور نیابتی جمہوریت کے ارتقاء کے پیچھے بھی یہی بنیادی عرفان کارفرما تھا۔ حال کی بیسب تحریکیں اسی عرفان کے مفہوم کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں تھیں۔

دوسرا معیار جسے ہمارے تہذیبی امور میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے ذیلی نوعیت کا ہے لیکن اس کا تعلق ایک دور رس سوال سے ہے یعنی یہ کہ "آدمی کا معیار کیا ہے"؟ اس سے یہ اعتراف مرتب ہوتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز کا پیمانہ فردِ انسانی ہے لیکن خود اس کے لئے بھی ایک پیمانہ موجود ہے۔ جس کی مدد سے اسے جانچا جا سکتا ہے۔ یہ پیمانہ وہ اقدار ہیں جو خالصتاً انسانی ہونے کے ساتھ ساتھ عالمگیر بھی ہیں اور حتمی بھی۔ یہ اقدار اخلاقی اور روحانی ہیں۔

جن لوگوں نے ہماری تہذیب کی تشکیل کی ہے اُن کی اقدار اور اُمنگیں اگرچہ انتہائی مختلف النوع رہی ہیں لیکن اُن کے درمیان ایک ربطِ باہم موجود ہے۔ یہ ربطِ باہم ہی وہ تخلیقی تحریک ہے جو اس دوگونہ معیار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔



ظاہر ہے کہ یہ معیار آنے والی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی سہل اور سادہ اصول پیش نہیں کرتے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس معاملے میں ہماری مدد ضرور کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ ہماری ان کوششوں کو جنہیں کامیاب ہونے کے لئے بروئے کار لانا ضروری ہے، مقصد بھی عطا کر دیں گے۔

ہمارے مسائل کا ایک پہلو ایسا ضرور ہے جو اپنی وسعت سے قطع نظر کم از کم نوعیت کے اعتبار سے نیا نہیں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ بین الاقوامی سیاست کا دور رس مقصد نیک دل لوگوں کے لئے اب بھی وہی ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ یہ مقصد ہمسائیگی کے تقاضے پورے کرنا اور اخوت کو فروغ دینا ہے۔

یہ بجا ہے کہ سبھی لوگ ان مقاصد کی پیروی نہیں کرتے لیکن تمام انسانوں نے ان مقاصد کی پیروی کی [illegible]

ترجیح دیتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سیاست میں ہمیشہ ایسا ہی رہے گا اور سماج کی بنیاد کسی اور مفروضے پر قائم ہی نہیں کی جا سکتی لیکن اس معاملے میں جہاں تک میرا تعلق ہے میں دیوتاؤں کے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پہلے کے مقابلے میں نیک دل آدمیوں کی تعداد دنیا میں آج زیادہ ہے، اور یہ کہ ہمارے دور کی حیرت انگیز ٹکنیکل اور سائنٹیفک ترقیوں کا نتیجہ اس تعداد میں کمی نہیں، اضافے کا باعث ہوگا۔

ایرچ فرومّ نے اپنی کتاب "آزادی کا خوف" میں اس امید افزا نقطۂ نگاہ کو مندرجہ ذیل لفظوں میں ادا کیا ہے:

"اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ تاریخ میں اتنی بے رحمی اور تباہ کاری کی شہادت کیوں ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو چیز حیرت بلکہ حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام حوادث کے باوجود جو آدمی کو پیش آئے نوعِ بشر نے وقار، جرأت، شرافت اور رحمدلی جیسے اوصاف کو جن کا ثبوت ساری تاریخ میں ملتا ہے اور جو آج بھی بے شمار لوگوں میں موجود ہیں نہ صرف قائم رکھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں فروغ بھی دیا۔"

ہمسائیگی اور قرب کا اندازہ ہمیشہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ آدمی، خیالات اور دوسری چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کتنے فاصلے تک بہ آسانی پہنچائی جا سکتی ہیں۔ حیرت انگیز مادّی ترقیات کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کم از کم کچھ مقاصد کے لیے ہمسائیگی کی حدود تمام کرۂ ارض تک پھیل گئی ہیں۔ پڑوس کے پیمانے کی اس تبدیلی کو بین الاقوامی سیاست میں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، بدقسمتی سے ہم پیمانے کی اس ناگزیر تبدیلی کے مطابق ہمسائیگی اور دوستی کی گہرائی اور اس کی وسعت میں اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

میرا خیال ہے کہ اس برّاعظم پر ہم نے اس مسئلے کو ضرور حل کر لیا ہے اور ہمارے دونوں ملکوں کے عوام اس پر بجا طور پر نازاں ہیں۔ بہر حال ضرورت اس بات کی ہے کہ امریکہ اور کینیڈا کے مراسم

اس معاشے میں ترقی کی طرف قدم ضرور اٹھا ہے بشترکہ اقدام سے تحفظ کے اصول کا فروغ اور پسماندہ ممالک کو اقتصادی اور ٹکنیکل مدد، یہ دونوں باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ہم نے درست سمت کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔

انسانی روابط کے مسئلے کا دوسرا نام سیاست ہے اور ہماری نسل کو اس مسئلے کا سامنا جس وسیع تر پیمانے پر کرنا ہے اس کا اظہار کئی سطحوں پر ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظہر قوت کی وہ مقدار ہے جو پالیسی کی تکمیل کا وسیلہ بننے والے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا مظہر ان سیاسی اداروں کی وسعت ہے جو پالیسیوں کا تعین کرتے ہیں۔ ڈپلومیسی کے بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ اب قومی ریاستوں کے درمیان نہیں ہوتا۔ فریقین کی حیثیت تہذیبوں کو حاصل ہے بلکہ بعض مسائل تو ایسے ہیں جو تمام نوعِ بشر کے لیے مشترک ہیں۔ جمہوری سماجوں میں ایسے لوگوں کی تعداد جو مستقبل کی تشکیل کے سلسلے میں فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یا ان میں دلچسپی لیتے ہیں، اب اتنی زیادہ ہے جتنی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں تھی۔

آئندہ صفحات میں اس بات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسائل کی مقدار اور وسعت میں جو نیا اضافہ ہوا ہے وہ جمہوریت اور بین الاقوامی سیاست میں کیا مفہوم رکھتا ہے۔

دُوسرا باب

# حربی قوّت کی وسعت

ایک مسئلہ جو ہماری نسل کے سامنے نئے اور بہت وسیع تر پیمانے پہ آیا ہے حربی قوت کی نئی حقیقتوں کا نتیجہ ہے. جوہری سائنس نے تباہ کارانہ حربی قوت میں اس حد تک اضافہ کر دیا ہر جو سابقہ معیاروں کے مطابق ناقابلِ یقین نظر آتا ہے۔ اس نئی تباہ کارانہ قوت تک کچھ لوگوں اور حکومتوں کی رسائی ہو چکی ہے اور متعدد کی ہونے والی ہے۔

قوموں کی پالیسی میں وسیلے کے طور پہ استعمال ہونے والی حربی قوت میں یہ اضافہ دوسرے اور متعلقہ شعبوں کے مسائل کو نئی اہمیت دے دیتا ہے اور ان کے فوری حل کا مطالبہ کرتا ہے۔

مجھے شبہ ہے کہ اس نئی مادی قوت کا جسے لوگوں نے بروئے کار لانا تو سیکھا ہے لیکن اُسے زیر کرنا نہیں سیکھا جمہوریت اور بین الاقوامی سیاست پہ جو اثر پڑے گا اس کی قدر و قیمت اور مفہوم کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس میں اربابِ حکومت بھی شامل ہیں اور دوسرے لوگ بھی. لیکن یہ بات تسلیم کرنے کے لئے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں کہ چند انسانی آدرش اور سیاسی طریقے جن کے متعلق اَب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر انسانیت کو اچھے اور پُرامن طور پہ رہنا ہے تو ان کا حصول مستحسن ہے۔ وہ مستقبل قریب میں یہ حیثیت اختیار کرنے والے ہیں کہ خود انسانی بقا کے لئے ہی ان کا حصول لازمی ہو جائے گا۔ ہمیں آئندہ ایسی متعدد باتوں کو کہیں زیادہ سنگین سمجھنا پڑے گا جنھیں اس وقت تک لوگ نظر انداز کرتے رہے ہیں اور یہ نظر اندازی اگر بغیر پاداش نہیں تھی تو کم از کم اتنا ضرور تھا کہ اس کے نتیجے فوری طور پہ تباہ کارانہ نہیں تھے۔

اس گنجائش کے باوجود ہم نے بطور افراد زندہ رہنا سیکھ لیا ہے اور اب تو یہ گنجائش اتنی کم نہ گئی ہے
کہ اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم تاریخ کے ایک ایسے مرحلے میں ہیں کہ جو بات انفرادی اور گروہی
سطح پر درست تھی وہ اب عالمگیر، سماجی اور سیاسی سطح پر بھی درست ہو گئی ہے۔ اگر ہمیں
زندہ رہنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم ان حقیقتوں کے تنظیمی اور سیاسی مفاہیم کو تسلیم کریں اور ان کے
مطابق عمل کریں۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ صورتِ حال کی وسعتوں کا واضح اور مکمل احساس
کیا جائے اور اس کی روشنی میں ایسی پالیسیوں پر عمل کیا جائے جو بسا اوقات مقاصد اور نتائج دونوں
کے اعتبار سے قومی حدود سے ماوراء ہوں گی۔

جو ٹیکنیکل حقائق بین الاقوامی اخلاق کے تقاضوں میں یہ انقلاب لانے کے درپے ہیں ان کے
بنیادی پہلوؤں تک کا ادراک مشکل نہیں ہے۔ اب سے چند سال پہلے تک جو قوی ترین
ہتھیار استعمال ہوا وہ میرے خیال میں ایک ایسا بم تھا جس میں شدید قسم کا دس ٹن
آتشیں مادہ تھا۔ جو ایٹم بم ہیروشیما پر پھینکا گیا اس میں بیس ہزار ٹن کے برابر آتشیں مادہ تھا
ہائیڈروجن ہتھیاروں کے نام سے جو ہتھیار حال ہی میں ایجاد ہوئے ہیں انھوں نے تباہ کاری
کی اس قوت میں ہزار گنا مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان ہتھیاروں کی قوت کا اندازہ اب ہزار ہا ٹن
کے حساب سے لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے مقابلے میں اب پھٹنے والا ہتھیار دس لاکھ
گنا قوت رکھتا ہے۔

آج ہزار ہا ٹن کی قوت کے پھٹنے والے ہتھیار اور معیاری ایٹمی پھٹنے والے ہتھیاروں میں جو
فرق ہے وہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا ثانی الذکر اور ان بموں کے درمیان جنھیں ہم قدرے
غیر شعوری طنز کے ساتھ دوسری جنگ کے رسمی بم قرار دیتے ہیں۔ ہمارا واسطہ تباہی کی دو قسم
کی مقداروں سے نہیں، بلکہ تین قسم کی مقداروں سے ہے۔ لیکن کیا سلسلہ یہاں ختم ہو جاتا
ہے۔ پینتیس ۳۵ سال پہلے رائٹ آنریبل ہربرٹ ایسکوئتھ نے کہا تھا کہ "سائنس نے ابھی

آخری بات کہہ چکی ہے؟

دھماکے کی اصطلاح میں بھی ہائیڈروجن بموں کی قوت کچھ کم لرزہ خیز نہیں لیکن اس قوت کا اس سے کہیں زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ صرف ایک بم کے پھٹنے سے ہزاروں مربع میل زمین شعاع زن زہر سے جسے بم کی گرد کہا جاتا ہے، آلودہ ہو جاتی ہے۔

دھماکے کے تباہ کارانہ نتائج اور شعاع زن زہر کے مقامی اثرات سے قطع نظر یہ بات بھی قابلِ قیاس ہے کہ چند سو ہائیڈروجن ہتھیار دنیا کے کسی گوشے میں حفاظت سے رکھے ہوئے پھٹنے والے ہتھیار کچھ مدت میں جو بہت زیادہ مختصر بھی نہ ہو فضا کو یہاں تک مسموم کر دیں کہ دنیا کے کروڑوں باشندوں کے شدید اور مزمن بیماریوں میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے یا یہ کہ اس قسم کے چند ہزار بموں کا استعمال خواہ وہ کہیں بھی ہو انسانی زندگی کے وجود کو ہی خطرے میں ڈال دے۔



مزید برآں ہماری موجودہ نسل میں ہی یہ ممکن ہے کہ صرف امریکہ، روس اور برطانیہ ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں کو بھی یہ استعداد حاصل ہو جائے کہ وہ جوہری بم تیار کریں اور انھیں جس نشانے پر چاہیں پھینک سکیں۔ اس بات کو مسئلے پہ بحث کے دوران بسا اوقات فراموش کر دیا جاتا ہے۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ حربی قوت کے ان مسائل پر جن کی وسعتیں اتنی خوفناک ہیں ان کے سیاسی اور دفاعی مفاہیم کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے اور ان تمام مفروضوں پر نظرثانی کی جائے جنھیں ہم اس سلسلے میں اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔

اس نظرثانی نے بعض لوگوں کو یہ نظریہ یاد کرا دیا ہے کہ ان ہتھیاروں کی خوفناک تباہ کارانہ قوت بجائے خود بڑی جنگ کے امکانات کو کم کر دے گی یا اُسے ناممکن ہی بنا دے گی۔ اس طرح انسانیت کو ختم کرنے کی بجائے یہ خود جنگ کو ہی ختم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر ہر فریق میں یہ استعداد ہو کہ وہ دوسرے فریق کو مکمل طور پہ تباہ کر سکے اور اگر ہر فریق کی انتقام کی استعداد اتنی وسیع ہو، اور حفاظت کا انتظام اتنا مکمل ہو کہ کوئی حملہ آور یہ اُمید نہ کر سکے کہ وہ انتقام

کارروائی کی ابتدا، سے پہلے ہی فریقِ ثانی کو شکست دے دے گا تو یہ بات دونوں فریقوں کی سمجھ میں آجائے گی کہ جنگ شروع کرنے کا نتیجہ مشترکہ تباہی ہوگا۔ یہ امکان ایک ایسے شخص کو جنگ سے شاید باز نہ رکھ سکے جو بد بھی ہو اور دیوانہ بھی — جیسے ہٹلر — لیکن یہ ایک ایسے شخص کو باز ضرور رکھ سکتا ہے جو صرف بد ہو۔ یہ ہے اس نظریے کا تار و پود۔

کچھ مدت ہوئی خود مالنکوف کے متعلق بھی یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس نے اپنی متعدد تقریروں میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ ایک دوسری عالمگیر جنگ دنیا سے تہذیب کو مٹا ڈالے گی۔ اس بنا پر پراودا نے اُسے سرزنش کی تھی اور روسی مبلغ اب پھر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیمونسٹ سماج میں جنگ سے بچ نکلنے کی صلاحیت ہے اور اس سے صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی شکست و ریخت کا شکار ہوگا۔ یہ خطرہ ہمیشہ موجود ہے کہ آدمی غیر شعوری عمل سے اپنے پروپیگنڈے کو بالآخر خود ہی باور کرنے لگے۔ لیکن میرے خیال میں یہ کچھ زیادہ ممکن نہیں کہ کریملن کے روسی ڈکٹیٹر واقعی اتنے بے وقوف یا کم علم ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہائیڈروجن کی اس دنیا میں اگر سیاسی طور پر نہیں، تو کم از کم مادی طور پر وہ ہمارے ساتھ ضرور ہیں اور یہ کہ ہم واقعی طور پر بقائے باہم پر عمل پیرا ہیں۔ مجھے امید بھی ہے اور یقین بھی کہ روسی ڈکٹیٹر بھی یہ بات جانتے ہیں۔ اس احساس کے نتیجے کے طور پر اگر باہمی رواداری نہیں تو باہمی ڈر کی بنیاد پر ہی کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔

زیادہ خطرہ غالباً یہ ہے کہ چین کے کیمونسٹ رہنما (جو ابھی انقلابی فتح کے غرور سے سرشار اور قومی اور کیمونسٹ اوہام کے سحر میں گرفتار ہیں) خود کو یہ باور کرا لیں کہ وہ جوہری جنگ کے نتائج سے کافی حد تک مامون رہیں گے اور ان کے قومی اقتدار اور سیاسی تنظیم کا تسلسل برقرار رہے گا۔ ان سے یہ خیال منسوب کیا جاتا ہے کہ چین کی آبادی اتنی زیادہ ہے اور اس کا سماج اتنا غیر ترقی یافتہ، غیر پیچیدہ اور لچکدار ہے کہ وہ ہر طوفان کے مقابلے میں نسبتاً محفوظ ہے۔ جوہری قوت چاہے اس میں کتنے ہی چھید ڈال دے چین کی گاڑی چلتی رہے گی چین کو پچھاڑا کبھی نہیں جا سکتا اگر جنگ میں چین

ملک نہیں بچیں گے۔

لیکن اس تسلی بخش واہمے میں اس علم سے کافی ترمیم ہو سکتی ہے کہ جیسا کہ سر ونسٹن چرچل اور دوسرے حضرات نے کہا ہے، ہائیڈروجن بم تعداد کے فرق کو برابر کرنے اور جغرافیائی حدوں کو بے اثر کرنے کی جو قوت رکھتا ہے وہ سابقہ ہتھیاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ ہائیڈروجن ہتھیاروں کی زد میں صرف فوجیں نہیں بلکہ علاقے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف ملک ہی نہیں بلکہ برِاعظم بھی غیر محفوظ ہیں۔ ہر ہائیڈروجن ہتھیار میں یہ قوت ہے کہ وہ ہزاروں مربع میل رقبے کو ویران کر دے خواہ اس کی آبادی کتنی ہی گنجان یا پھیلی ہوئی کیوں نہ ہو۔ یہ ہتھیار جغرافیائی سیاست میں ایک نیا موڑ پیدا کرتے ہیں اور فوجی اور ڈپلومیٹک حکمتِ عملی میں ایک نئے طریقِ کار کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس صورت میں میرے نزدیک یہ بات بہت احمقانہ ہے اور اس سے امن یا سلامتی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کہ سرد جنگ میں ایک دوسرے کو دھمکیاں دی جائیں یا بہادری کا مظاہرہ کیا جائے۔ ہائیڈروجن یا ایٹم بموں سے دھمکانا اتنا ہی بچکانہ ہے جتنا تلواروں کو کھڑکھڑانا۔ لیکن یہ خطرناک زیادہ ہے۔ ہائیڈروجن اور نفرت کا میل بہت برا میل ہے۔ اب جب داؤ اتنا بڑا ہے، سیاسی اور فوجی لیڈروں کے لئے یہ بات پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وہ گرم خون کو اپنی فراست پر غالب نہ آنے دیں اور عمل یا جوشیلی گفتگو سے پہلے پرسکون طور پر غور و فکر کریں۔

مغرب میں بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کمیونسٹ لیڈر بے دردانہ منصوبے تیار کرنے والے لوگ ہیں، وہ ایسے شاطر ہیں جن کے جذبات برف کی طرح سرد ہیں اور انھیں اپنے جذبات و خیالات پر مکمل قابو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض کمیونسٹ لیڈر واقعی ایسے ہیں۔ غصے، رنجش اور بے خود غلط نفرت اور بدہضمی کا جو طویل ناکامی کا نتیجہ ہوتی ہیں ان کے سیاسی اور جذباتی توازنات میں شامل ہو جانا ناقابلِ فہم ہے۔ اس خطرے کا ہمیں ہمیشہ سامنا رہے گا کہ کرملین کیمپ اپنی نئی قوت کے بھروسے پر کوئی جوشیلا داؤ لگا بیٹھیں۔ جمہوری ملکوں کی دفاعی اور تدارک کی

اپنے بڑھتے ہوئے خدشات کی وجہ سے ایسی غیر دانشمندانہ پالیسیاں اپنانے پر مجبور ہو جائیں جن کے نتیجے غیر متوقع اور ناخوشگوار ہوں۔

خطرے کا سامنا ایک اور سمت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت مشرق بعید میں ایسی حکومتیں ہیں جن کے لیڈر اس بات میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسرے اُن کی جنگوں میں شریک ہو جائیں۔ اُن کی چند قومی پالیسیوں کی تکمیل کا صرف یہی طریقہ ہے۔ اُن کے آخری مقاصد بجائے خود قابلِ ستائش ہو سکتے ہیں اور اُن کے حصول کے مجوزہ طریقوں سے اختلاف کے باوجود ہم اُن سے ہمدردی رکھ سکتے ہیں۔ ان مقاصد کا تعلق آزادی اور قومی علاقوں کی بحالی سے ہے جنھیں کمیونسٹوں نے اُن سے چھین لیا ہے، اُن کی بازیابی کے لئے جنگ کی تجدید کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور ان لیڈروں کا خیال ہے کہ مغرب کے کچھ ملک اس جنگ میں اُن کا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ جہاں تک جمہوریت کے عمل اور شہریوں کی شخصی آزادی کی قدر کا تعلق ہے، یہ متعلقہ ایشیائی حکومتیں بھی وہ سب کچھ نہیں کرتیں جو کیا جانا چاہیئے۔ لیکن نجات کی اس لڑائی کو ہمیشہ جمہوریت کی جنگ قرار دے دیا جاتا ہے اور بلاشبہ اس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ کمیونزم کی مخالفت میں جو کچھ بھی کیا جائے وہ جمہوری جدوجہد ہے۔ اس نظریئے کے مطابق ہٹلر سب سے بڑا جمہوری ہوگا، حالانکہ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر بہت سوں کو اعتراض ہوگا۔

جب وہ وقت آئے گا کہ جوہری ہتھیار مختلف حکومتوں کے پاس وسیع تر پیمانے پر پہنچ جائیں تو یہ خطرہ بڑھ جائے گا۔ جب اس قسم کے دباؤ جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، ان لوگوں اور حکومتوں کے لئے جنھیں ایک خاص علاقے اور فوجوں کی ایک مقدار پر مؤثر اقتدار حاصل ہے یا چند جوہری ہتھیاروں پر مختصر سے وقت کے لئے بھی مؤثر کنٹرول حاصل ہے، ناقابلِ برداشت ہو جائیں گے، تو اس کے نتیجے اگر اور کچھ نہیں تو قابلِ افسوس ضرور ہو سکتے ہیں۔

جوہری قوت کا اس قسم کا بین الاقوامی انتشار اس مروجہ نظریئے پر بھی اثر انداز ہوگا

اس وقت ہماری سلامتی کی بہت بڑی امید ضرور ہو سکتا ہے لیکن اس کی بنیاد بہرحال دوسری باتوں کے علاوہ اِس مفروضے پر ہے کہ دُنیا دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ موجودہ حالت میں بھی یہ کہنا بہت سہل البیانی ہے لیکن بہت جلد واقعات اس نظریئے پر مزید غالب آجائیں گے۔

اگر ہم کبھی اس دہشت ناک مرحلے پر پہنچ گئے جب ایک درجن کے قریب ملکوں کے پاس ہائیڈروجن بموں کا اسٹاک ہو اور ان بموں کو دوسرے براعظموں میں پھینکنے کے آلے ہوں اور ایسے اڈے بھی ہوں جہاں سے دوسرے ملکوں پر نشانہ لگایا جا سکے تو غور کیجیے کہ مختلف النوع تدارکات کس حد تک مؤثر ہو سکیں گے۔

اِن تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ٹھوس انتقامی کارروائی اور جوہری تدارکات کا نظریہ جسے صحیح خارجہ اور دفاعی پالیسی کے ایک جز کی حیثیت سے میں خود بھی تسلیم کرتا ہوں معیاری حل نہیں ہے، یہ مہلت حاصل کرنے کا بہترین وقتی طریقہ تو ہو سکتا ہے لیکن مسئلہ امن کا دور رس حل نہیں ہے۔



ہمیں اپنی توجہ کو اس امر کی طرف بھی مبذول کرنا چاہیئے کہ جوہری ہتھیار رکھنے اور جوہری جنگ لڑنے کی استعداد کا قومی خود مختاری کے نظریئے اور عمل پر کیا اثر پڑے گا۔ جان سٹورٹ مل نے ایک صدی پہلے آزادی پر اپنے مشہور مقالے میں "منفعتِ ذاتی" اور "منفعتِ دیگراں" پر مشتمل افعال کا جو فرق بیان کیا تھا وہ آپ کو یاد ہو گا۔ اس کے ضابطۂ اخلاق میں یہ فرق ایک ایسی بنیاد تھا جس پر انفرادی آزادی قائم رہ سکتی تھی اور سماج کی سلامتی میں بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ خود مختاری کے نظریئے میں ان ترمیموں میں جنھیں ہم نے اب تک اپنی سلامتی کے پیشِ نظر تسلیم کیا ہوا ہے ایک ترمیم ہمیں اس قسم کی بھی شامل کرنی پڑے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ بات ناممکن ہے کہ ذی شعور افراد خواہ وہ قومی خود ارادیت کے اصول کے کتنے ہی حامی کیوں نہ ہوں، خود مختاری کے کسی ایسے نظریئے پر ہمیشہ ایمان لائے رہیں جو کسی چھوٹے سے غیر ذمہ دار ملک کے لئے یہ بات قانونی طور پر ممکن بنا دے، کہ

وہ اپنے اقتصادی ذرائع کو دور مار ہائیڈروجن ہتھیار تیار کرنے یا ایسے اڈے قائم کرنے کے لئے استعمال کرے جہاں سے دُنیا کے کسی بھی پڑوسی ملک کو نشانہ بنایا جا سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسائل ابھی کئی سال بعد واقعیت کی شکل اختیار کریں گے اور موجودہ صورت میں اُن پر کسی قسم کے اظہار تشویش کو بیکار قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اہمیت ایک خالص علمی بحث سے کہیں زیادہ ہے اور وہ سنجیدہ اور دوا تفکارانہ توجہ کے مستحق ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صرف آج یا زیادہ سے زیادہ مستقبل قریب کے مسائل ہی پبلک کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یا موضوعِ بحث بنتے ہیں۔

ایک مسئلہ البتہ ایسا ضرور ہے کہ جس کا سامنا ہمیں آج یا مستقبلِ قریب میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اس معقول لیکن غلط نظریئے سے پیدا ہوتا ہے کہ تمام جوہری ہتھیار ایک ہی سطح کی تباہ کارانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے ایک ہمہ گیر جنگ کے ماسوا اُن کا استعمال ممکن نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے کہ چھوٹی جنگیں مختلف حیثیت کی ہیں، وہ اتنی خطرناک نہیں اور انھیں بغیر کسی مشکل کے محدود رکھا جا سکتا ہے۔

یہ نظریہ اسی صورت میں مدلّل ہو سکتا تھا اگر پھٹنے والے صرف بڑے بڑے جوہری ہتھیاروں کا ہی وجود ہوتا یعنی ایسے ہتھیار جن میں آتشیں مادّہ لاکھ یا دس لاکھ ٹن ہو۔ یہ ممکن ہے کہ وسیع تباہی پھیلانے والے اس قسم کے ہتھیار کسی جنگ میں استعمال نہ ہوں بشرطیکہ وہ جنگ مایوسی کے عالم میں خاتمۂ وجود کے لئے نہ لڑی جا رہی ہو۔ اس قسم کی ہمہ گیر افتاد سے بچنے کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ دونوں طرف سے اس پابندی کو خاموش طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ کے دوران ہائیڈروجن بموں کا حربی استعمال نہ ہوگا۔ یہ خاموش معاہدہ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہائیڈروجن بموں کا استعمال باہمی تباہی اور انتشار پر منتج ہو سکتا ہے۔

لیکن اب چھوٹے ایٹمی ہتھیار بھی عام ہو گئے ہیں جن کی دھماکے کی قوت وسیع اور

ایٹمی ہتھیاروں نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔

صدر آئزن ہاور نے ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء کو کہا تھا "اب کسی جنگ میں جہاں یہ چیزیں (چھوٹے جوہری ہتھیار) خالص فوجی نشانوں پر اور خالص فوجی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتی ہوں، وہاں میں ایسی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ انہیں بالکل اسی طرح استعمال نہ کیا جائے جس طرح گولی یا کسی اور چیز کا استعمال ہوتا ہے"۔ لہٰذا یہ باور کرنا حقائق پسندی نہیں، کہ اگر مقامی یا وسیع پیمانے پر کوئی جنگ ہوئی تو ان چھوٹے مصافیاتی ہتھیاروں کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔

ان ہی مقاصد مثلاً ہوائی اڈوں اور وسائلِ رسل و رسائل کو بے کار بنانے کے لئے اگر رسمی ہتھیار استعمال کئے جائیں تو چھوٹے جوہری ہتھیاروں کے مقابلے میں پچاس یا سو گنا بم، ہوائی جہاز اور ہوا باز ضروری ہوں گے۔ رسمی ہتھیاروں کے اس وسیع استعمال سے جہاں حربی نتائج اتنے ہی برآمد ہوں گے وہاں تباہی بھی اتنی ہی پھیلے گی۔ مزید برآں اگر ہر ممکن مصافیاتی مقصد کے لئے ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کئے جائیں گے تو ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے جن کے پاس بہت زیادہ انسانی قوت ہے اور وہ اس کے بے رحمانہ استعمال میں سنگدل واقع ہوئے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ بات فیصلہ کن بھی ہو سکتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم اس دور میں واقعی داخل ہو رہے ہیں جہاں یہ توقع رکھنا غلط ہوگا، کہ جن طاقتوں کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں وہ چھوٹی یا بڑی جنگ میں ان کا استعمال کسی بھی شکل میں نہیں کریں گی تو اس نئی صورت حال سے جو نتیجے مرتب ہوتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے۔

پہلی بات لازمی طور پر یہی ہے اور یہ بات اب ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہے کہ کسی بھی قسم کی جنگ کو ہر ممکن اور عزت مندانہ طریقے سے روکا جائے۔ ایک جنگ جو ایک جزیرے پر شروع ہو بہت جلد ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ ایک طرف سے فوجی ٹھکانوں پر ایٹم بموں کا مصافیاتی استعمال

تباہ کاری کے بے رحمانہ جوش میں دوسری طرف سے مخالف ملک کی راجدھانی پر ہائیڈروجن بموں کا حربی استعمال ہو جائے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ آزاد قومیں خطرے یا دھمکی کے مقابلے میں ہمیشہ پسپا ہو جائیں۔ ایک فریق کی طرف سے اس قسم کی پسپائیاں جن سے پیدا ہونے والے خلاء کو فریقِ ثانی کی پیش قدمیاں اسی رفتار سے پُر کرتی رہیں، خواہ بعض حالات میں دانشمندانہ ہی کیوں نہ ہوں، بیشتر اوقات حقیقی امن کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ بسا اوقات اس قسم کی پسپائیوں کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیش قدمی کرنے والا فریق بے بنیاد توقعات قائم کر لیتا ہے اور پیچھے ہٹنے والے فریق کو اور پیچھے ہٹنا پڑ جاتا ہے۔ اس سے رعایت دینے والے فریق کے دل میں غصہ اور مایوسی بڑھتی ہے، جو بسا اوقات ایسے نتیجے پر پہنچ جاتی ہے کہ اس پر قابو پانا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔

اگر پیچھے ہٹنا ضروری اور دانشمندانہ ہو تو اس کے فوراً بعد ایسے اقدامات کئے جانے چاہئیں جن کا مقصد تصادم کو روکنا اور اس کے اسباب کو ختم کرنا ہو۔ ایک چیز ایسی ہوتی ہے جسے غیر مسلح یا فاصل علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس طریقے کو دنیا میں بُری طرح بروئے کار لایا گیا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی اسے تجربی یا عارضی طور پر سُود مند انداز میں آزمایا جائے۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کے معاہدے ہیں مثلاً ایک حد پر لڑائی بند کرنے کا معاہدہ، عارضی صلح، آگے نہ بڑھنے کا معاہدہ یا یہ معاہدہ کہ کسی مخصوص صورتِ حال میں طاقت استعمال نہیں کی جائے گی۔

دانشمند لوگوں کو اس قسم کی تدبیروں اور مصلحتوں سے اعلانِ بیزاری نہیں کرنا چاہیئے۔ جن کا مقصد مسائل کے زیادہ بنیادی اور بہتر حل کے لئے وقت حاصل کرنا ہو، یا جن کی بدولت ایسی جنگ کو روکا جا سکتا ہو جس کا "رسمی" رہنا ممکن نہ ہو اور وہ سرعت کے ساتھ سمندروں کو پار کر سکتی ہو اور براعظموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہو۔

اس قسم کی عارضی تدابیر کی اگرچہ اکثر ضرورت پیش آسکتی ہے لیکن ان تدابیر کو ہمیں مسائل

فراموش نہیں کرنی چاہیئے، کہ خطرہ ٹیکنیکل نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ اس خطرے کا منبع ان عوامل کا انکشاف نہیں جن سے شِق سالمہ یا سالمات کی غیر معمولی دھماکے کے ساتھ پھٹنے والی ترکیب ممکن ہوئی بلکہ اس کا حقیقی منبع یہ واقعہ ہے کہ یہ عوامل اَب اَیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو صدیوں سے ایک دُوسرے کے خلاف حربی قوّت کا استعمال کرتے رہے ہیں۔

ان حالات میں ہمیں یہ احتیاط برتنی چاہیئے کہ ہم اپنے وقت، اپنی اہلیت اور اپنے منصوبوں کو صرف نئے ہتھیاروں کے خلاف دفاع اور جوابی حملے کے طریقوں اور اصولوں پر اس حد تک مرکوز نہ کر دیں کہ اس سے زیادہ اہم کام کو نقصان پہنچے یا اس میں تاخیر پیدا ہو۔ یہ زیادہ اہم کام یہ ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کر کے اور بین الاقوامی کشیدگیوں کو دُور کر کے ان ہتھیاروں کے استعمال کو غیر اغلب بنا دیا جائے۔



آخری مقصد اب تک یہی ہے کہ بیشتر اس کے کہ جنگ ہمیں ختم کر دے ہم خود اُسے ختم کر دیں۔

اس مقصد کا تقاضا ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ سمجھوتے کے وسائل تلاش کریں جن سے ہمیں سب سے زیادہ خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کا تقاضا ہے کہ تلوار کو توڑ کر اس سے ہل کی پھالی بنا لی جائے لہٰذا ہمیں اس مشکل کام کو جو بسا اوقات مایوس کن نظر آتا ہے جاری رکھنا چاہیئے، کہ ان لوگوں کو جنھوں نے تشدّد کو ایمان بنا لیا ہے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہیں کہ آخر کار اب وہ وقت آ گیا ہے جب تشدّد کا استعمال سُود مند نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی ہوگی۔

یہ بات غیر حقیقت پسندانہ حتّٰی کہ صرف واہمہ معلوم ہو سکتی ہے کہ انسان کی بقا کا انحصار عالمگیر عدم تشدّد کے اصول پر رکھا جائے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم فوراً ایسی کوششوں میں مصروف نہ ہو جائیں جن کا مقصد یہ ہو کہ تشدد پر زیادہ نہیں بلکہ کم اعتماد کیا جائے یا یہ کہ زیادہ تشدّد کی بجائے کم تشدد پر بھروسہ کیا جائے۔ ان دونوں سمتوں میں قدم بڑھانے کی کافی گنجائش ہے۔

یہ امید ہم سب کے دل میں موجود ہے کہ کسی قسم کے ایٹمی ہتھیار کبھی بھی استعمال نہیں ہوں گے،

دوسری حکومتوں کے مقابلے میں سیاسی مقاصد کی پیروی کا طریقہ صرف انتہائی غیر مہذب ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔ یہ طریقہ اتنا غیر مہذب اور اتنا خطرناک ہے کہ دنیائے جدید اب اسے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔ لیکن اس کے باوجود تہذیب اور غالباً نوعِ بشر کے مستقبل کو کلیتاً صرف اِس بات پر منحصر نہیں رکھا جاسکتا، کہ ہم خودضبطی کی اس آخری منزل پر فوراً ہی پہنچ جائیں۔

اس صورت میں ہمیں یہ کوشش بھی کرنی چاہیئے، کہ اگر ممکن ہوسکے تو ہم نظریۂ تناسب کو فروغ دیں اور خالص واقعاتی منطق کی بنا پر اس نظریئے کو فریق ثانی سے منوانے کی بھی انتہائی کوشش کریں۔ اگر تمہارے خلاف قوت استعمال کی جائے تو قوت کا یہ استعمال اس بات کا لازمی جواز نہیں، کہ جواب میں اس قوت سے زیادہ قوت استعمال کی جائے جو حصولِ مقصد کے لئے ضروری ہو۔ اگر آپ چاہیں تو اس نظریئے کو "مناسب اور متوازن جوابی کارروائی" کا نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ "ٹھوس انتقامی کارروائی" کے نظریئے کی طرح یہ نظریہ بھی جارحانہ حملے اور جوہری قوت کے مسئلے کا پورا حل نہیں، لیکن یہ اس حل کا ایک پہلو ضرور ہے۔

اس اعتبار سے حربی قوت کی پیمائش اتنی ہی ضروری ہے جتنی اس کی نوعیت۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں رائے عامہ کا یہ ترقی پذیر رجحان کہ اس چیز کو جسے ایٹم کی پراسراریت کہا جاتا ہے، سوچے سمجھے بغیر تسلیم کرلیا جائے، خطرناک ہے۔ اس رجحان کا مطلب یہ ہے، کہ حربی قوت کا استعمال یا اس کے استعمال کی مقدار کو اہمیت حاصل نہیں، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس قوت کا منبع کیا ہے۔

یہ بات میں یقیناً تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے مخصوص حالات پیش آسکتے ہیں جن میں استعمال ہونے والی قوت کی نوعیت انتہائی اہم ہو۔ مثلاً مجھے پوری طرح علم ہے کہ خواہ منطقی، ٹیکنیکل، یا فلسفیانہ دلیلوں کا کتنا ہی استعمال کیا جائے لیکن اگر دوسری بار کسی ایشیائی خطے اور ایشیائیوں پر

ایک خاص نسل کو جو سفید فام نہیں ایک مخصوص قسم کی ہولناکی کے لئے چن لیا گیا ہے، خواہ استعمال میں آنے والا ایٹم بم کتنا ہی کم ہولناک کیوں نہ ہو۔

• کسی مخصوص جگہ یا کسی مخصوص صورتِ حال میں ایٹم بم کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے میں اس بات کو بہت اہمیت ہے کہ اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ بہت ممکن ہے کہ کئی صورتوں میں اس ردِ عمل کو فیصلہ کن اہمیّت بھی حاصل ہو۔ لیکن یہ استدلال اگرچہ بعض حالات اور بعض علاقوں میں بحالتِ موجودہ صحیح ہے، تاہم اُسے عمومی شکل دینا آئندہ کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ایٹمی ہتھیار کبھی استعمال ہی نہیں ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ مشین گنیں اور دُور انداز توپیں بھی کبھی استعمال نہیں ہوں گی۔ میں اشارہ اس خطرے کی طرف کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دُنیا بھر میں یہ بات غیر ناقدانہ طور پر تسلیم کر لی گئی، کہ قابلِ نفرت چیز ہتھیاروں کی ایٹمی نوعیت ہے اور بجائے خود تشدد کا استعمال نہیں تو اس کا نتیجہ یہ مفروضہ ہو سکتا ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے انسانوں کو دیسی ہتھیاروں سے ہلاک کرنا اتنا قابلِ اعتراض نہیں۔ آدمی خواہ گولی سے ہلاک ہو خواہ تیر سے خواہ ایٹمی دھماکے سے۔ وہ مرتا بہرحال ہے، لہٰذا مذمت حربی قوّت کے استعمال کی ہونی چاہیئے نہ کہ اس کے مادّی مخرج کی۔



کسی ہوائی اڈے پر دس ٹن کے دیسی بم پھینکنے کے لئے سَو ہوائی جہازوں کو بھیجنے اور دھماکے کی اتنی ہی قوّت کے ایک ایٹمی بم کو پھینکنے کے لئے ایک ہوائی جہاز بھیجنے میں فرق ہے۔ اور ضرور ہے لیکن یہ فرق ٹیکنیکل نفسیاتی یا سیاسی نوعیت کا ہو تو ہو سکتا ہے اسے اخلاقی فرق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دُوسری طرف کسی ہوائی اڈے، فوجی کیمپ یا جنگی جہاز پر کسی بھی قسم کے ہتھیار کا استعمال کسی بھی ذی فہم شخص کے نزدیک اس بات کا جواز نہیں بن سکتا کہ حملہ آور یا اس کے اتحادیوں کے کسی گنجان شہر پر دس لاکھ ٹن کے آتشیں مادّے والا ایک ہائیڈروجن بم پھینک دیا جائے بشرطیکہ صورتِ حال صاف طور پر یہ ظاہر نہ کرتی ہو کہ حملہ آور کے ہمہ گیر جارحانہ جنگ کی

ابتدا کر رہا ہے۔ اس بات کا تعلق براہ راست "ٹھوس انتقامی کارروائی" کے نظریئے کے ساتھ ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

لہٰذا یہ بہت ضروری ہے کہ اس نظریئے اور نظریۂ تدارک کے سلسلے میں جو غیر محتاط لسّانی یا خیال آرائی ہوئی ہے اس پہ نظر ثانی کی جائے۔ ٹھوس انتقامی کارروائی کی استعداد اور یہ غیر مبہم اور علانیہ عزم کہ مخصوص حالات میں اس استعداد کو بروئے کار بھی لایا جائے گا۔ میرے لیئے اس امکان کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ کوئی متوقّع حملہ آور فوری اور قطعی فتح کی اُمید میں اچانک ہمہ گیر حملہ کرنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائے لیکن یہ تصوّر بالکل دوسری بات ہے کہ ٹھوس انتقامی کارروائی کی اس استعداد کو ہماری طرف سے مقامی حملے یا تصادم کے خلاف استعمال کیا جائے، یا کسی ایسے حملے کے خلاف بطور دفاع استعمال کیا جائے جو ٹھوس نوعیّت کا نہ ہو۔ اس تصوّر کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ دُنیا کے مستقبل کا انحصار ہی اس فیصلے پہ ہوگا، کہ ایک بڑے جنگی جہاز یا ایک چھوٹے جزیرے پہ حملے کا جواب ایک پُورے برّاعظم پہ ہائیڈروجن بم پھینک کر دیا جائے یا نہیں۔

کسی بھی قسم کے ہتھیار کے متعلّق یہ سہل بیانی تو بہت ہی ہولناکی کی حامل ہے کہ یا تو اس کا استعمال بالکل نہ ہو یا بے دریغ ہو۔ ایک ایسے دَور میں جب جانبین کے پاس جوہری ہتھیار ہوں انتہائی حملے کے بغیر انتہائی قوّتِ تدارک کے نظریئے کو اپنانا دونوں فریقوں کیلئے تباہ کُن ہوسکتا ہے۔

میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس نظریئے کو کبھی بھی قابلِ جواز نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً اسی پُرانے نظریئے کو لیجیئے "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" جہاں تک افراد کا تعلق ہے اس نظریئے کو کم از کم مغرب میں عام طور پہ غیر مہذّب اور وحشیانہ ہی سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں کے اعتبار سے بھی یہ ایسا ہی ہے لیکن اسے بھولنا مناسب نہیں، کہ بعض نظریئے اس سے بھی کمتر سطح کے ہیں جو متوازی جبر کے نظریئے سے زیادہ غیر مہذّب اور بہیمانہ ہیں۔ غیر متناسب اور زبردست جبر متدارک کا

پاداش میں آدمی کو پھانسی دینے کا طریقہ نچلی سطح کے نظریئے کی ایک مثال ہے۔ اس نظریئے کو لوگ تدارک کی قدر و قیمت کے اعتبار سے اس وقت قابلِ جواز ٹھہرا رہے تھے۔ جب موسٰی کے اس نظریئے کی تبلیغ کو تین سَو سال ہو چکے تھے کہ انتقامی قوت کی مناسب حدیں مقرر ہونی چاہئیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب مہذّب ملکوں کے سماج میں انسان غیر متناسب جبر کے نظریئے سے ایک بار پھر اُوپر اُٹھ گئے ہیں۔

یہ نظریہ کہ طاقت کا محدود استعمال کیا جائے، یہ استعمال حالات کے مطابق ہو اور لازمی طور پر اتنا ہی جو حصولِ مقصد کے لئے ناگزیر ہو حفاظتِ خود اختیاری کے نام پر قابلِ جواز ہے۔ اور میرا خیال ہے، کہ یہ تصوّر قدرتی قانون کے ضابطے میں بھی مضمر ہے۔

مثال کے طور پر میرے ملک میں سسکاٹچیوان کورٹ آف اپیل کے مسٹر جسٹس مارٹن نے میکنیل اور رہل کی اپیل کا فیصلہ سُناتے ہوئے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

"قانون حفاظتِ خود اختیاری کے حق کو تسلیم کرتا ہے، وہ اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ طاقت کو طاقت سے روکا جائے لیکن کسی حق کا ناجائز استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔ اور حفاظتِ خود اختیاری کا حق ایسا ہے جس کا ناجائز استعمال بہ آسانی ہو سکتا ہے جو طاقت استعمال کی جائے اس کا تناسب اتنا نہیں ہونا چاہیئے جس کا صورتِ حال کی بدیہی نزاکت مطالبہ نہیں کرتی۔"

کنیڈا کے ضابطۂ تعزیرات کی دفعہ ۶۶ اس طرح ہے:

"ہر وہ شخص جسے قانون طاقت کے استعمال کا حق دیتا ہو، اس کے استعمال کی زیادتی کے لئے قابلِ مواخذہ ہے۔ یہ مواخذہ اس فعل کی نوعیت اور شدّت کے اعتبار سے ہوگا جس کی بنا پر زیادتی سرزد ہوئی ہو۔"

اسی اصول کی ایک مثال امریکہ کے قانون سے منتخب کی جاتی ہے۔ ایک مقدمے میں جو ریاست بنام کیفوس کے نام سے مشہور ہے دہارٹن نے مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے:

"کسی حملے کو روکنے یا اس کا مقابلہ کرنے میں اس سے زیادہ طاقت استعمال نہیں ہونی چاہیئے۔

قوت سے زیادہ قوت استعمال کرتا ہے جو حصولِ مقصد کے لئے ضروری ہو تو وہ حملہ آور کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے"۔

یہی اصول برطانیہ کے قانون میں بھی موجود ہے۔ ہالسبری کی کتاب " قوانینِ برطانیہ " کے صفحہ ۴۴۸ پر درج ہے:

"کوئی شخص جو قانونی طور پر اپنی یا اپنے گھر کی حفاظت کر رہا ہو، اس بات کا پابند نہیں، کہ وہ حملہ آور کو ہلاک کرنے سے پہلے پسپا ہو جائے یا اس کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ اسے یہ بھی حق ہے کہ وہ حملہ آور کا پیچھا کرے اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش کرے لیکن اگر حملہ آور گرفتار ہو جائے یا مزاحمت کئے بغیر پسپا ہو رہا ہو تو اس صورت میں اسے ہلاک کرنے والا شخص قتل کا مجرم ٹھہرے گا"۔

یہ بنیادی اصول فرانسیسی قانون میں بھی ہے۔ فرانس کے انسائیکلوپیڈیا میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"حفاظتی کارروائی حملے کے تناسب سے ہونی چاہیئے اور ہر قسم کی زیادتی سے گریز ضروری ہے، بالخصوص جب جائداد کا جائز دفاع مدِ نظر ہو، جب تک ایسے حالات نہ ہوں جو جرم کی شدت کو گھٹاتے ہوں، حفاظتِ خود اختیاری میں زیادتی ناقابلِ جواز ہے"۔

اور فرانس کے ضابطۂ تعزیرات کے صفحہ ۲۳۳ پر درج ہے کہ " یہ بات کہ کسی پر حملہ ہوا ہے، یہ معنی نہیں رکھتی کہ اسے مقابلے میں حملہ آور کو لامحدود نقصان پہنچانے کا قانونی حق ہے"۔

میرے خیال میں یہ بات دانشمندانہ ہوگی اگر ہم اس جوہری دور میں اس امر کو تسلیم کر لیں کہ اسی قسم کا پابندیاں عائد کرنے والا اصول انفرادی یا اجتماعی حفاظتِ خود اختیاری کے اس حق میں بھی مضمر ہے جس کا ذکر اتحادی سبھا کے چارٹر کی دفعہ ۵۱ میں کیا گیا ہے۔ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی، منیلا پیکٹ، امریکی ریاستوں کے متلازم امداد کے معاہدے اور آزاد دنیا کے دوسرے دفاعی معاہدوں کی بنیاد چارٹر کی اسی دفعہ پر ہے۔

ہو مہذب سماج کے نزدیک کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے جو مشروط ہو، یعنی اس کا انحصار اس بات پر ہو کہ حملہ آور بھی اسی پابندی کو پہلے یا جواباً تسلیم کر لے۔ یہ اصول ایسا ہے جسے مہذب لوگوں کو اس کی اپنی قدر و قیمت کی بنا پر ہی مان لینا چاہیئے۔ اُن کی تہذیب کا مفاد اسی میں ہے۔ اگر تشدّد پھوٹ پڑے تو اس اصول کی کارفرمائی جنگ کو اسی حد تک محدود رکھنے میں مدد دے سکتی ہے، جو حملے کی پسپائی کے لئے ضروری ہو۔ مزید برآں یہ اصول بجائے امن کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی ملک اپنے پڑوسی کے خلاف فوجی حملہ کرتا ہے تو اس پڑوسی، اس کے اتحادیوں بلکہ تمام آزاد قوموں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اتحادی سبھا کے چارٹر کے اصولوں کے اندر حملہ آور کو پسپا کرنے کے لئے اجتماعی قوت کا مناسب استعمال کریں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس قوت کا اس قسم کا استعمال اُن پر فرض بھی ہے۔ لیکن اس کی بنا پر انہیں یہ اخلاقی پروانہ نہیں مل جاتا کہ وہ طاقت کا لامحدود اور ہمہ گیر استعمال کریں اور حملہ آور سماج کو مکمل طور پر تباہ کرنے کی کوشش کریں۔

یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ کوئی ایسا نظریہ جو قوتِ متدارکہ کو محدود کرنے کی تجویز پیش کرے، وہ جارحانہ حملے کو زیادہ اغلب اور اس کی کامیابی کو آسان تر بنا دے گا۔ بہرحال ملکی قانون میں اس اصول نے ایسا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ اور اگرچہ دونوں صورتیں بہت مختلف ہیں لیکن مختلف قوموں کے روابط میں بھی اس اصول سے یہ نتیجہ پیدا ہونا ضروری نہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس اصول کے بغیر ایک شخص یا چند اشخاص کے فعل کی بنا پر نسلِ انسانی کا وجود ہی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

قوت پر پابندی لگانے کے اس نظریئے کے ساتھ ایک فرسودہ اور پامال فقرہ بھی متعلق ہو گیا ہے جو گذشتہ چند سال سے بہت مقبول بھی ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے کہ "امن ناقابلِ تقسیم ہے۔" یہ قول ایک اعتبار سے صحیح ضرور ہے لیکن دوسرے اعتبار سے غلط بھی ہے۔ اس کی صداقت اس امر میں مضمر ہے کہ ہماری دُنیا میں جہاں ہر ملک کا انحصار دوسرے ملکوں پر ہے یہ آگاہی بہت بجا ہے کہ دُنیا کے کسی بھی گوشے میں جنگ کا پھوٹ پڑنا بجا طور پر تمام ملکوں کے لئے موجبِ تشویش ہو سکتا ہے کیونکہ امن میں یہ خلل اور اس سے پیدا ہونے والی بے امنی تمام دھرتی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے

لیکن اگر امن کے ناقابلِ تقسیم ہونے کے تصوّر کا مفہوم یہ لیا جائے کہ جنگ کی ہر مقامی ابتداء کو لازمی اور ناگزیر طور پر عالمگیر جنگ پر منتج ہونا چاہیئے اور اس کے خلاف کارروائی بھی اسی اعتبار سے ہونی چاہیئے، تو یہ تصوّر غلط ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ خطرہ موجود رہے گا، اور جیسا کہ میں نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خطرہ واقعی حقیقی ہے لیکن اگر اس خطرے کو یقینی ہی مان لیا جائے تو یہ نظریہ کسی ایک یا دُوسرے فریق کو بہت آسانی سے گمراہ کر سکتا ہے کہ وہ آنے والے واقعات سے ڈر کر یا قبل از وقت ان کا انسداد کرنے کے پیشِ نظر وسیع پیمانے پر ایسی کارروائیاں کر دے جو اس خطرے کو واقعی حقیقی بنا دیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں حکومتوں کے وجدانی فیصلے مسلمہ فوجی اور سیاسی نظریوں کے مقابلے میں صحیح تر ثابت ہوئے۔ یہ ان ہی فیصلوں کا نتیجہ تھا کہ خالص فوجی منطق (بشرطیکہ ایسی کسی چیز کا وجود ہو) کے برعکس کوریا کی جنگ کو مقامی رکھا گیا، ہند چینی کے تصادم کو محدُود کر دیا گیا، اور عربوں اور بنی اسرائیل کی جنگ کو بھی مقامی سطح سے اُوپر نہ اُٹھنے دیا گیا۔

ہمارے رُوحانی رہنماؤں نے ہمیشہ اعلان کیا ہے کہ تمام نوعِ بشر ایک خاندان ہے، ایک اعتبار سے یہ وحدت صرف مجموعۂ افراد نہیں ہے بلکہ صحیح معنیٰ میں ایک اکائی ہے۔ یہ حقیقت اب بدیہی سے بدیہی تر ہوتی جا رہی ہے اور اس میں ان وسائل کو دخل ہے جو رُوحانی نہیں۔ اس کا بہت بڑا باعث روز افزوں مادّی انحصارِ باہم ہے جسے ٹیکنیکل ترقیاں معرضِ وجود میں لا رہی ہیں لیکن اگر اس انسانی کُنبے کو زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس وحدت کے مفہوم کو زیادہ گہرے طور پر سمجھنا چاہیئے اور اس کی روشنی میں عمل بھی کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایک جسم ہیں تو ایک اُنگلی کٹنے کے نتیجے کے طور پر سارے بازو کو کاٹ دینا نہ تو ضروری ہے اور نہ دانشمندی ہے۔ بائیبل میں ایسا کوئی حکم نہیں جو ایک آنکھ کے بدلے میں جان لینے کا مشورہ دیتا ہو۔

لیکن ایک ایسا نظریہ ہی کافی نہیں جو بعض حالات میں ہمیں قوّت کے ہر استعمال سے روکتا

بھی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ اگر طاقت کا استعمال ضروری بھی ہو تو اُسے کن کن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

• اس سلسلے میں ایک اور فرسودہ تصوّر جس پر تنقیدی نظر ڈالنا میرے نزدیک از بس ضروری ہے، یہ ہے کہ جنگ کا مقصد فتح ہے۔ یہ تصوّر ایک معنٰی میں صحیح ضرور ہے لیکن یہ مکمّل سچّائی ہرگز نہیں۔ یہ ایک ایسا نعرہ ہے جو حقیقت میں ذہنی بے عملی کا پردہ بن سکتا ہے۔ جس حد تک اسے مکمّل سچّائی کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا، جیسا کہ اس صدی کی دو عظیم جنگوں کے دوران مغربی جمہوریتوں اور دوسرے ملکوں میں بہت سے لوگ تسلیم کرتے رہے ہیں، اسی حد تک یہ ممکن رہے گا کہ اس سے طویل جنگوں اور بے مثل تشدّد کی ترغیب ملے۔ ایسی جنگی چالوں کی ترغیب جن کی بنیاد دشمن کی مکمّل تباہی یا غیر مشروط سپر اندازی پر ہو اور اس سلسلے میں اس سیاسی صورتِ حال پر کوئی توجہ نہ دی جائے جو اس فتح کا نتیجہ ہوگی۔ مختصر الفاظ میں یہ تصوّر ہمیں اس تجربے سے دوچار کر سکتا ہے کہ ہم جنگ جیت جائیں اور امن جیتنے میں ناکام رہیں۔ یہ تجربہ ایسا ہے جسے ہم بخوبی سمجھتے ہیں لیکن امن فتح سے زیادہ ضروری ہے اور جنگ کا آخری مقصد یہی ہے۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر عین دورانِ جنگ میں بھی ہمیں اپنی نگاہیں صرف فوجی فتح پر ہی نہیں بلکہ ان دُور رس مقاصد پر بھی مرکوز رکھنی چاہئیں جو زمانۂ جنگ کے بعد بھی قائم رہیں گے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے، کہ جہاں جابرانہ حکومتیں اور بُرے نظریئے عارضی ہیں وہاں انسانی نسلیں اس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک اس کرۂ ارض پر زندگی کا وُجود ہے۔ لہٰذا یہ بات احمقانہ ہے کہ ہم عدم توجہی سے انسانی کُنبے میں اختلاف کی ایک گہری اور ناقابلِ عبور خلیج پیدا کر دیں۔ اس قسم کا مستقل اختلاف پیدا کرنا کسی طرح بھی مُفید نہیں خواہ ہمارا مقصد کتنی ہی راستی پر مبنی ہو۔

وقتی دشمن کی طرف سے جو زیادتیاں، بے رحمیاں اور مصیبتیں وارد کی جائیں اُن کی بنا پر نفرت اور تلخی کا احساس ممکن ہی نہیں بلکہ لازمی بھی ہے۔ اس قسم کے جذبات قابلِ فہم بھی ہیں، اور جائز بھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسے دور میں جو ...

کو تباہ کرنے کی قوت موجود ہے اور متعدد کی بہت جلد اس قوت تک رسائی ہونے والی ہے۔
اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ صحیح سیاسی تدبر کا بنیادی اور بالاتر مقصد مصالحت اور مختلف قوموں کے درمیان رواداری پیدا کرنا ہے۔

اگر پھر کبھی لڑائی چھڑے تو نہ صرف لازمی طور پر اس امر کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ حملہ آور کو پسپا کر کے اور شکست دے کر اُسے اس بات کا یقین دلایا جائے کہ جارحانہ حملہ خسارے کا سودا ہے بلکہ اس بات پر بھی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیئے کہ جنگ کو محدود رکھا جائے، اور محدود مقاصد کی تکمیل ہوتے ہی اُسے فوراً ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد فوراً ہی ایک ایسے امن کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے جو منصفانہ ہو دحشیانہ نہیں۔ یہ امن ایسا ہونا چاہیئے جس میں آئندہ جنگ کے بیج موجود نہ ہوں۔



تا حال جمہوریتوں کی فرد عمل موجودہ صدی کے دوران اس معاملے میں ایسی ہرگز نہیں رہی کہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا جاسکے۔ گذشتہ دو جنگوں میں آزاد دُنیا کی رائے عامّہ ایک بے رحم حملہ آور کے خلاف شدید جذبات میں مبتلا رہی ہے۔ حملے کو پسپا کرنے کی کارروائی نے ایک ایسی مذہبی جنگ کی حیثیت اختیار کر لی جو نیکی کی مدافعت کے لئے لڑی جا رہی ہو۔ ان جنگوں کے ساتھ ہمہ گیر مقاصد وابستہ کر لئے گئے۔ مثلاً دُنیا میں جمہوریت کا تحفّظ کرنا۔

جب جنگ لڑی جا رہی تھی اور اس کا نتیجہ مشکوک تھا تو اس کے سیاسی مقاصد پر تفصیلی غور بسا اوقات اس بنا پر پسِ پُشت ڈالا جاتا رہا کہ اس سے جمہوری دُنیا اور اتحادیوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ہمارے مقاصدِ امن مبہم ہو گئے ہیں اور انھیں صرف ایک مقصدِ جنگ کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے جو دشمن کی شکست اور تباہی ہے۔
یہی ابہام ہماری زمانۂ بعد از جنگ کی مُشکلات اور ناکامیوں کا باعث بنا۔

گذشتہ واقعات کی یاد دہانی اور ماضی کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانا سود مند ہوتا ہے۔ مارگینتا

اس کے چند ہی سال بعد ہم ایک ایسے جرمنی کو جو ازسرِ نو اسلحہ بند ہو چکا ہے اپنے اتحادیوں کی صف میں شامل کر رہے ہیں۔ جاپان کو ناکارہ کر دینا بھی ہمارے منصوبوں میں شامل تھا لیکن ۱۹۵۰ء کی تشویشناکی کے پیشِ نظر ہم اس سے زیادہ مسلح طاقت بننے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دو معین ریاستوں کے درمیان دشمنی مستقل حیثیت شاذونادر ہی اختیار کرتی ہے اور عمومی یا غیر معین مقاصد کے لئے جنگ پائیدار امن کا باعث بھی شاذونادر ہی بنتی ہے۔

لیکن ان تمام مفروضوں میں ایک اہم اور بنیادی استثناء کی گنجائش ضرور ہے۔ اگر کوئی حملہ آور ہماری زندگی اور تہذیب کے مراکز پر جوہری بموں سے بھرپور حملہ کر دیتا ہے تو ہم اس کے لئے مجبور ہوں گے کہ اس کا جواب اسی طرح دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس جوابی حملے پر کوئی پابندی یا شرط عائد نہیں ہوگی۔ اس صورت میں جارحانہ کارروائی کرنے والے کا حملہ اپنے آخری مفہوم میں اقدامِ جنگ سے کہیں زیادہ سنگینی کا حامل ہوگا۔ یہ ایک ایسا فعل ہوگا جسے خودکشی کہا جا سکتا ہے اور اس کے فاتح ہدف کے لئے بھی اس کا مفہوم کچھ کم سنگین نہ ہوگا۔ ان حالات میں ایک ایسی دفاعی پالیسی جو یقینی اور بھرپور انتقامی حملے کے اصول پر مبنی ہو، جارحانہ حملہ کرنے والوں کو باز رکھنے کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہے اور بہ حالتِ موجودہ یہی بہترین حکمتِ عملی ہے۔ اگرچہ یہ امن اور جنگ کے مسئلے کا دُور رس حل نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت اس کا کوئی نعم البدل موجود نہیں۔ بہرحال اس خیال سے نہ تو کسی کو تسکین ملتی ہے اور نہ حقیقی تحفظ کا احساس ہی پیدا ہوتا ہے، کہ امن کا غیر مستقل انحصار ہائیڈروجن بم پر ہے اور یہ کہ پائیداری پیدا کرنے والی قوت اب طاقت کا توازن نہیں بلکہ دہشت کا توازن ہے۔

تو ہائیڈروجن بموں کے بھرپور حملے کی دہشت ناک تباہی ایک مختلف چیز ہے لیکن اگر حملہ محدود تر پیمانے پر شروع ہو تو میرے نزدیک یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ حملہ آور کے خلاف قوت کا استعمال محدود اور علانیہ مقاصد کے تحت ہی ہونا چاہیئے، خواہ یہ

قوت سیاسی ہو یا فوجی۔

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں قوموں کا رویّہ اس معاملے میں موجودہ صدی کے مقابلے میں زیادہ دانشمندانہ تھا۔ اس وقت جنگیں محدود اور مخصوص مقاصد کے لئے لڑی جاتی تھیں۔ گفت گوئے مصالحت کے بعد یہ جنگیں کسی معاہدے پر ختم ہو جاتی تھیں۔ بسا اوقات یہ عمل دشمن کی فوجوں کے مکمّل ہتھیار ڈالنے کے بغیر ہی سرانجام پاجاتا تھا اور کسی جانب سے غیر مبہم فوجی فتح کا اعلان بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد جو امن قائم ہوتا تھا اس کا وقفہ بسا اوقات کافی طویل ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جنگ اور معاہدۂ امن کے نتیجے کے طور پر اس فریق کو کچھ مراعات حاصل ہو جاتی تھیں جو نسبتاً قوی ثابت ہوا ہو۔

خواہ اس پر قولِ متناقض کا ہی گمان گذرے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جو بالعموم خود غرضانہ اور مادّی ہوتے تھے، کئے جانے والے فوجی اقدام صرف یہی نہیں، کہ بیسویں صدی کے عوامی اور جمہوری جہادوں کے مقابلے میں کم خون ریز تھے بلکہ بسا اوقات اُن کے نتائج بھی زیادہ قابلِ برداشت ہوتے تھے۔ مروّجہ جہادوں میں تقریباً ہر چیز ـــــ جنگ، ہتھیار، ڈپلومیسی، فتح، شکست، انتقام اور عوامی جذبہ ـــ کلّی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بدقسمتی سے کلّیت کے ان مظاہر کے ہمراہ کلّی دانش، تدبّر اور دُوراندیشی نہیں ہوتی۔

اس سے پہلے کے زمانوں میں یہ ممکن تھا کہ حالتِ جنگ میں بھی مفاد کے متعلق سمجھوتہ ہو جائے اور اس طرح لڑائی مصالحت پر منتج ہو جائے۔ آج اگر کسی فریق کی جنگ نیکی اور صرف نیکی کے لئے لڑی جا رہی ہے یا اُسے اس شکل میں پیش ہی کیا جا رہا ہے تو سمجھوتے کا تصوّر تک گناہ بن جاتا ہے مزید برآں تاریخ گواہ ہے کہ جب لوگوں کی نگاہیں محدود اور مخصوص سیاسی مقاصد پر مرکوز ہوتی تھیں اور جب وہ فوجی لڑائی کے نقشے ان سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر ہی تیّار کرتے تھے تو انھیں اپنے افعال کے نتائج پر کہیں زیادہ کنٹرول حاصل ہوتا تھا۔

سیاسی مقصد ہی ہو خواہ یہ ایک سیاسی نعرے کی حیثیت سے کتنی ہی مقبول ہو سکتی ہو۔ بہر حال یہ مقصد ایک بین الاقوامی پولیس ایکشن کے لئے تو ہرگز موزوں نہیں اور آج کل تو اس کے نتائج ایسے ہو سکتے ہیں کہ آخری جنگی مقصد کا مسئلہ صرف نظریاتی بن کر نہ جائے۔

میں یہ تجویز پیش کر چکا ہوں کہ صرف اس استثنائی صورت کے ماسوا کہ یکایک باہمی تباہی کا دورہ پڑ جائے آزاد دنیا کی فوجی قوت کو صرف محدود سیاسی مقاصد کے لئے استعمال ہونا چاہیئے۔ ان میں اہم ترین مقصد یہ ہوگا کہ حملے کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اگر یہ شروع ہو جائے، تو اسے پھیلنے سے روکا جائے، شکست دی جائے اور معاہدۂ امن کے لئے راستہ تیار کیا جائے۔

یہ ٹھوس انتقامی کارروائی کے نظریئے سے کچھ مختلف چیز ہے اس کا مقصد اتنا حملہ آور کو شکست دینا نہیں جتنا آزادی کے رقبے کا تحفظ اور دوسرے تصادم کو روکنا ہے۔

میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

دسمبر ۱۹۵۴ء میں نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن کی کونسل کا پیرس میں وزارتی سطح پر جو اجلاس ہوا تھا اس میں ہم نے ایک فیصلہ کیا تھا جس کا ایک پہلو میرے نزدیک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ وہ پہلو یہ تھا کہ رقبۂ زیر معاہدہ کے تحفظ کے لئے حفاظتی جنگ کی جو سکیمیں تھیں ان میں ایک ایسی تجویز بھی شامل کر لی گئی جس نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی سکیموں کو ترقی دینا ممکن بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی حکمتِ عملی بھی طے پا گئی جو مغربی یورپ پر حملے کی صورت میں اتحادی طاقتوں کے سپریم ہیڈکوارٹر کو اس قابل بنا دے کہ وہ معاہدے کے یورپی ممبروں کے علاقوں کے مؤثر تر دفاع کے لئے ایک ایسی ڈھال کو عالمِ وجود میں لے آئے جو حملے کو روکنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اس نئی حکمتِ عملی کا جو نئی قوت پر مبنی ہے ایک بہت بڑی اہمیت کا پہلو یہ ہے کہ بالآخر یہ معاہدے میں شامل ہونے والے ملکوں کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ روسی مراکز پر انتقامی جوہری حملے کی اہلیت پر ہی کلیتاً بھروسہ نہ کریں، بلکہ

اسی طرح کوریا میں جارحانہ حملے کے خلاف آزاد قوموں کی کارروائی محدود رہی ہے۔
اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شمالی کوریا یا چین کے لوگوں کو تباہ کیا جائے بلکہ یہ کہ جنگ کو محدود رکھا جائے، حملے کو پسپا کیا جائے اور اس کے بعد لڑائی کو بند کرنے کے معاہدے کی بات چیت شروع کی جائے جو امن کا پیش خیمہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ نامکمل صورتیں اور محدود پالیسیاں مغربی رائے عامہ کے بعض عناصر میں مایوسی اور جھلاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ امکان کم ہے کہ صورتِ حال کے تقاضوں کو پورا کرنے میں واقعی کوتاہی برتی گئی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ کے ان عناصر نے مسئلے کی حقیقتوں اور عمل میں لائی جانے والی کارروائیوں کے دور رس مقصد پر یا تو سنجیدگی سے غور نہیں کیا، اور یا انھیں اس سے آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔



حالیہ تجربے نے ایک اور حقیقت کو بھی ثابت کیا ہے، وہ یہ کہ اصولِ جنگ کو پالیسی کا خادم ہونا چاہیئے۔ جب جنگی حکمتِ عملی آقا بننے کی کوشش کرے جیسا کہ دو بین الاقوامی جنگوں میں ہوا، تو یہ کوئی تعجب نہیں کہ فتح بہت گراں اور پیچیدہ نئے مسائل کی صورت میں رونما ہو۔ حالانکہ یہ نئے مسائل ایسے نہیں جو ناقابلِ انسداد ہوں۔ بشرطیکہ ماضی کے واقعات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ صحیح اور متوازن دور اندیشی سے بھی کام لیا جائے۔



کلازوٹز کے اس مقولے کا کہ "جنگ پالیسی کو دوسرے طریقوں سے جاری رکھنے کا ذریعہ ہے"۔ کلازوٹز کے اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں بالعموم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ فوجی قوت کے استعمال کا ایک ایسا جواز ہے جس کی بنیاد نیکی سے مکمل انکار پر ہو لیکن میرے نزدیک اس کا مرکزی مفہوم زیادہ گہرا ہے۔ یہ مفہوم اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ فوجی قوت کو خارجہ پالیسی کا ایک آلہ ماننا چاہیئے اور یہ کہ صحیح جنگی حکمتِ عملی خالصتاً بلکہ بنیادی طور پر بھی صرف فوجی کا سودا نہیں
[illegible]

وہ مقاصد اور ذرائع میں خلط مبحث کا باعث ہوگا اور کم اہمیت کی باتوں کو غلط فوقیت دیئے
کا موجب بنے گا جو نامکمل اور کوتاہ نظری پر مبنی مقاصد کی پیروی کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔

• لیکن اگر جمہوریتوں کے منتخب لیڈروں کو جو ہمارے نظام میں آخری فیصلہ کرتے ہیں،
پیشہ ورانہ مشورہ دیتے وقت فوجی اور سیاسی اسباب میں مناسب تعلق ملحوظ رکھنا ہے تو اس سے
کئی تنظیمی اور دستوری ضمنی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اگر فوجی حکمتِ عملی کو خارجہ پالیسی کی
لونڈی بننا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگ میں فوجی حکمتِ عملی کے مشورے کی بنیاد
فوجی اور سیاسی وجوہ کے امتزاج پر ہونی چاہیئے اور یہ کہ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں تجاویز امن
مرتب کرنے میں فوجی، نفسیاتی، اقتصادی اور دیگر سیاسی عناصر کے متوازن اور عمیق جائزے
کو دخل ہونا چاہیئے۔



اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ڈپلومیٹک افسر ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے ایسی سطح پر
پہنچیں جہاں ان پر اہم پالیسیوں کی سفارش کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو تو انھیں فوجی امور کے متعلق
پوری اور بالغ نظرانہ واقفیت ہونی چاہیئے۔ اسی طرح جب فوجی افسر منصب کے اس درجے میں داخل
ہوں جہاں انھیں اہم پالیسیوں کی سفارش کرنی پڑے تو سیاسی اور ڈپلومیٹک امور سے آگاہی
اور واقفیت کو ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا حصہ بنانا ضروری ہو جائے گا۔

اس ضرورت کے احساس کے پیشِ نظر ہم نے کنیڈا میں دوسری جنگ عظیم کے کچھ ہی دیر بعد
ایک نیشنل ڈیفنس کالج قائم کیا تھا جہاں تینوں قسم کی مسلح افواج کے کرنل اور بریگیڈیر کی سطح
کے منتخب افسر اور ڈپلومیٹک اور دوسری متعلقہ سول سروسوں کے منتخب افسر ایک سال تک
ایسے دور رس مسئلوں کا مل کر مطالعہ کرتے تھے جو کلیتہً حکومت کے کسی بھی شعبے کی ذمہ داری کی
حدود میں داخل نہیں۔ اسی طرح امریکہ میں بھی ایک نیشنل وار کالج قائم ہوا تھا اور لندن میں امپیریل
ڈیفنس کالج تو ایک نسل سے یہ کام کر رہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں پیرس میں ناٹو ڈیفنس کالج قائم کیا گیا
جو اسی قسم کے مقصد کی بین الاقوامی سطح پر تکمیل چاہتا ہے۔ پیشہ ورانہ تربیت کی سطح پر یہ تمام

اقدامات ایسے ہیں جو درست سمت میں اٹھائے گئے ہیں۔

اسی مسئلہ سے متعلق ایک اور مسئلہ ہے۔ ایک ایسی مشینری تیار کرنا جو نبرد آزما فوجوں اور رقبہ کمانڈروں کے لئے اصولِ جنگ کے سلسلے میں رہنمایانہ فیصلے کر سکے اور دفاعی پروگراموں کے لئے حربی اندازے اور ہدایتی احکام کے مسودے تیار کر سکے۔ یہ مشینری ایسی ہونی چاہیئے، جو پیشہ ورانہ سطح پر فوجی، سیاسی اور خارجہ پالیسی سے متعلق امور کا مشترکہ لحاظ رکھنے کی اہل ہو اور اُنھیں حکومتی فیصلوں کے لئے پیش کرنے سے پہلے اُن پر پورا پورا غور کر سکے۔

فوجی اور خارجہ پالیسیوں کے فیصلوں کا یہ تنظیمی امتزاج جس کی میں وکالت کر رہا ہوں، اس صدی کی دو جنگوں کے دوران ممتاز جمہوری ملکوں میں نمایاں طور پر ناپید تھا۔ اس وقت مروجہ خیال بہ ظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ایک بار جب جنگ شروع ہو جائے تو خارجہ پالیسی کو پچھلی صف میں چلا جانا چاہیئے اور فوجی پالیسی کو اگر مقصود بالذات نہ بھی بنایا جائے تو کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیئے، کہ یہ عام قسم کے فوجی مقاصد مثلاً "کمل فتح" یا "غیر مشروط سپر اندازی" کے ماسوا اور کسی چیز کی تابع نہ ہو۔

یہ کہنا متعلقہ لوگوں پر نکتہ چینی نہیں لیکن نظام پہ جائز تنقید ضرور ہے کہ جنگی پالیسیوں کے مختلف مقاصد کے متعلق جو نمایاں طور پر فوجی رویّہ اختیار کیا گیا اُسے اُن مایوسیوں میں کافی دخل ہے جن سے ہمیں فتح کے بعد دوچار ہونا پڑا۔ دوسری جنگ کے دوران مغربی اتحادیوں نے سٹاف کے افسرانِ اعلیٰ کی جو کمیٹیاں قائم کیں وہ عام طور پر کلیتہً مسلح افواج کے پیشہ ور ممبروں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں۔ مثلاً بین الاقوامی سطح پر سٹاف کے چیفوں کی مشترکہ کمیٹی۔ یہی وہ معراج تھی جہاں سیاسی اور فوجی کنٹرول اور پالیسی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے فیصلے طے پاتے تھے۔ اس قسم کے عمل کے لئے یہ جگہ ہمیشہ بہت زیادہ مؤثر اور پُرسکون نہیں ہوتی۔ جہاں ہوائیں تیز چل رہی ہوں۔ وہاں ماحول میں تھوڑی بہت پراگندگی آ ہی جاتی ہے۔

یقین ہے کہ یہ تبدیلیاں تخلیقی مسئلوں سے صحیح آگاہی کی آئینہ دار ہیں کیونکہ جن مسائل کا قومی سطح پر سامنا ہوتا ہے وہ بین الاقوامی دفاقوں میں زیادہ وسیع اور پیچیدہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ خیال کرنا حماقت ہوگا کہ تنظیمی مسائل کو قومی یا بین الاقوامی سطح پر حل کیا جا چکا ہے۔ یہ خیال کرنا بھی حماقت ہوگا کہ ان مسائل کو کسی خاص سمت کی طرف تیزی سے قدم بڑھا کر یا اس معاملے میں بہت آگے بڑھ کر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کوشش رسمی منطق کے تقاضوں کو پورا تو کر سکتی ہے لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ مختلف ملکوں اور متعلقہ شعبوں کے فکری ارتقاء کی روشنی میں کسی خاص موقع پر تیزی کے ساتھ کسی ایک طرف بڑھنا مناسب حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہو۔ لیکن یہ اطمینان کہ قدم درست سمت میں اٹھ رہا ہے تبھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے نظریئے کو عمل کا رہنما بنائیں تاکہ یہ صحیح فیصلوں پر پہنچنے میں ہماری مدد کر سکے۔

---

# تیسرا باب
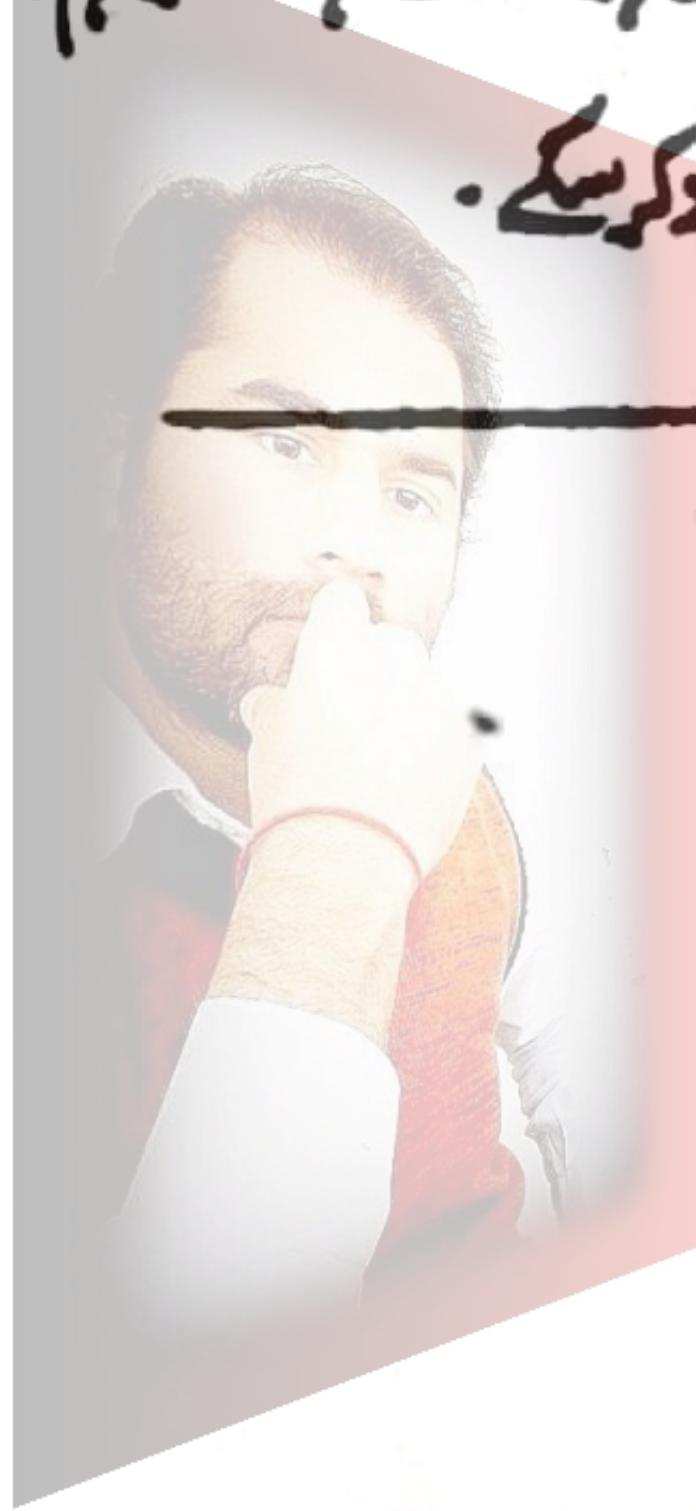
# وفاق — پالیسی طے کرنیوالے نئے یونٹ

تقریروں کے اس سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے میں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جن بین الاقوامی مسائل کے متعلق ہماری موجودہ نسل کو یہ گمان گذرتا ہے کہ اُن پر قابو پانا ممکن نہیں' اُن کا امتیازی پہلو اُن کی ندرت نہیں بلکہ ان کا بہت قوی الجثہ شکل میں ہمارے سامنے آنا ہے۔ بنیادی طور پر وُہ انسان کی سیاسی زندگی کے قدیم مسائل ہی ہیں جن کا اُسے خود اپنی ریاست میں یا دوسری ریاستوں کے ساتھ مراسم کے سلسلے میں سامنا ہوتا رہا ہے۔

میں نے اس تبدیلی کا اس اعتبار سے جائزہ لینے کی کوشش کی، کہ پالیسی کے وسیلے کے طور پر استعمال ہونے والی حربی قوّت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے چند اُن مسئلوں کا بھی ذکر کیا جو یا تو اس کا نتیجہ ہیں اور یا اس کی وجہ سے ان کی شدّت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

اَب میں یہ جائزہ لینا چاہتا ہوں — اور ظاہر ہے کہ یہ سرسری ہی ہوگا — کہ جس سیاسی سماج کی طرف سے خارجہ پالیسی کے فیصلے کئے جاتے ہیں یا اُن کی تکمیل کے سلسلے میں قدم اُٹھائے جاتے ہیں اس کی ساخت کیسی ہے۔

اب ہم جس نئے دَور میں داخل ہوئے ہیں اس میں خارجہ پالیسی یا جنگی حکمتِ عملی کا فیصلہ کرنے والی اِکائی اُیک قومی ریاست نہیں رہی خواہ وُہ کتنی ہی بڑی ہو بلکہ یہ اکائی قومی ریاستوں کا ایک وفاق ہوتا ہے جو کچھ مقاصد کے لئے متحد ہو جاتی ہیں۔ اس بات نے اس مسئلے کو فوری اہمیت دے دی ہے کہ اس مشترکہ نظام کے اندر تعاون اور اتحاد کو فروغ دیا جائے۔

اتحاد کی کامیاب تنظیم کا مسئلہ ہمیشہ مشکل رہا ہے حتیٰ کہ جنگ کے زمانے میں بھی یہ مسئلہ آسان نہیں ہوتا۔ امن کے زمانے میں تو اس کی ضرورت ہمہ وقت محسوس ہی نہیں کی گئی لیکن آج جنگ اور امن دونوں صورتوں میں اس کی تنظیم انتہائی ضروری بھی ہے اور مشکل بھی۔

دوسری باتوں کی طرح بین الاقوامی مراسم میں بھی مقاصد اور وسائل کا ابہام یا اُن کا غلط ملط خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ابہام یا خلط ملط جہاں پیدا ہو سکتا ہے یا خطرے کا باعث بن سکتا ہے وہ اتحادوں یا وفاقوں کے متعلق آزاد قوموں کا رویّہ ہے۔

آج وفاق یا مشترکہ صف بندیاں بین الاقوامی مشنری کے صرف ایسے پرزے نہیں رہے جن کی تشکیل ہم نے اس لئے کر لی ہو، کہ وہ ہمارے تحفظ کے لئے مفید ہوں گے۔ یہ وفاق تمام آزاد سماج کی وحدت اور یک جہتی کے اظہار ہیں خواہ یہ کتنے ہی مبہم کیوں نہ ہوں۔ بنیادی طور پر اس وحدت اور یک جہتی کا باعث آمریت کا خطرہ ہے۔ آزاد سماج کے لئے اتحاد اور قوت کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ اس کا اس خطرے سے تحفظ کیا جائے۔ بلکہ یہ اتحاد اس چیز کا اصلی جوہر بھی ہے جس کا تحفظ مقصود ہے۔

جب ہم وقتاً فوقتاً اس قسم کی باتیں سنتے ہیں کہ برّاعظمی تحفظات پر، مزید صرفہ یا ہماری جنگی اسکیموں یا اسلحہ کے ذخیرے میں تناسب کا کوئی فرق شمالی امریکہ کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ تنہا ہی اپنی راہ پر چل نکلے اور اتحادیوں کو نظر انداز کر دے تو جو چیز ہمارے لئے موجبِ تشویش بنتی ہے اس کا ایک باعث میرے خیال میں مقاصد اور وسائل کا یہی خلط ملط ہے۔

گھیرے برّاعظمی احساس کی یہ پالیسی مجھے کم نظری پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ سیاسی طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے آزاد اور دوست ممالک کی قسمت ہماری قسمت سے وابستہ نہیں اور انھیں الگ رکھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے اتحادی صرف حصولِ مقصد کے وسیلے ہیں۔ اس میں یہ خود غرضانہ اور غلط نظریہ مضمر ہے کہ واشنگٹن اور اوٹاوہ کے لوگوں کی لندن یا پیرس

حربی قوت اور سکیورٹی کے امور ایسے ہرگز نہیں کہ انہیں فراموش کیا جائے یا ان کی اہمیت کو کم کر دیا جائے۔ امریکہ کا ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ اگرچہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت آزاد قوموں کی عظیم صف کی یک جہتی ہے اور امن کی عظیم ترین بنیاد آج یہی ہے۔

میرے خیال میں یہ بات غیر اغلب ہے کہ سوویٹ حکمراں جمہوریت کو اس میدان میں للکاریں گے جہاں ہماری قوت کی برتری مسلّمہ ہے۔ سوویٹ حکمراں جدید اسلحہ کے میدان میں ہمیں للکار کر اپنے وجود اور اپنی سلطنت کے وجود کو خطرے میں ڈالیں گے، یہ بات واقعی غیر اغلب ہے۔ اس امر کا فی ثبوت ہے کہ کمیونسٹ طریقِ جنگ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم پر حملہ کرتے وقت اس چیز سے فائدہ اٹھایا جائے جسے وہ ہمارے باہمی تضاد سمجھتے ہیں۔ اس طریق جنگ کے مطابق وہ ہمیشہ ہمارے وہ پہلو تلاش کرتے ہیں جہاں ہم ان کے خیال میں کمزور ہوں۔ جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے کہ جمہوری ملکوں کے اتحاد کی صفوں میں نفاق اور انتشار پھیلانے کی کوشش کی جائے اور اس سے بھی کہیں زیادہ یہ کوشش کی جائے کہ امریکہ کو اس کے دوستوں اور اتحادیوں سے الگ کر دیا جائے انہیں کامل یقین ہے کہ اس معاملے میں ان کا فائدہ بے شمار ہے اور نقصان بہت کم۔

لہٰذا موجودہ صورت حال میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ جو ملک آزادی کے تحفظ اور امن کو قائم رکھنے کے لئے مل کر کام کر رہے ہیں وہ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد قائم رکھیں۔

اس یک جہتی کو ایک طے شدہ اور یقینی بات سمجھتے ہوئے مطمئن ہو کر بیٹھ جانا مناسب نہیں ہمارے وفاق کے تمام ممبر ملک جمہوری ملک ہیں جہاں آزادی اور خود حکومتی کی روایات قائم ہیں۔ یہ بات اس مضطرب دور میں قوت کا باعث ہوگی یا کمزوری کا۔ اس کا انحصار بہت بڑی حد تک اس بات پر ہوگا، کہ ہمارے وفاق میں شامل قومیں ایک دوسرے کے ساتھ کس حد تک تعاون کے لئے تیار ہیں اور کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا انحصار اس بات پر بھی ہوگا، کہ جب مشترکہ مفاد

تمک کرسکتی ہیں۔

ایک آزاد جمہوری ریاست کے شہریوں کے باہمی مراسم پر جس اصول کا اطلاق ہوتا ہے اسی اصول کا اطلاق بنیادی طور پہ آزاد وفاق کے ممبروں کے باہمی مراسم پر بھی ہوتا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پالیسیاں جن سے ایک اہم اقلیت کو نہ صرف اختلاف ہو بلکہ وہ انھیں غیر منصفانہ اور اکثریت کی قوت کا ناجائز استعمال بھی سمجھتی ہوں، انھیں اگر نافذ بھی کیا جائے تو مشکل کے ساتھ ہی نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ان پالیسیوں پہ برسر اقتدار لوگوں کا بضد رہنا تمام سماج کی یک جہتی میں فرق ڈالتا ہے اور اس طرح جمہوری عمل میں خلل پڑتا ہے۔ ہمارے دونوں ملکوں میں داخلی طور پہ اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اس مثال کو بین الاقوامی سطح پہ دُہرانے کا حوصلہ ہم نہیں کرسکتے۔

زیادہ اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ واحد جمہوری ملک کی طرح جمہوری ملکوں کے مفاد میں بھی متحدہ اقدام کی بنیاد بحث، یقین اور رضامندی پہ ہونی چاہیئے۔ بڑے اور نسبتاً متضاد العناصر سماج میں خواہ وہ قومی ہو یا بین الاقوامی اس قسم کی رضامندی کا سوال خاص طور پہ مشکل بھی ہے اور خاص طور پہ ضروری بھی۔ اگر ہم اس مسئلے کا قومی سطح پہ جائزہ لیں تو اس سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ جن مسئلوں کا ہمیں بین الاقوامی سطح پہ سامنا ہوگا ان کی نوعیت کیا ہوگی۔



امریکہ کئی خطوں پہ مشتمل ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص جسے امریکہ کی قومی پالیسیوں کا تجربہ ہے یا اُن سے واقفیت ہے وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اسی طرح کنیڈا جیسے ملک میں بھی جو رقبے کے اعتبار سے وسیع اور متعدد خطوں پہ مشتمل ہے لیکن جسے دو ایسی قوموں نے بنایا ہے جو زبان، مذہب اور تمدن کے اعتبار سے مختلف ہیں، ہمیں اُن فنون پہ خاص توجہ مرکوز کرنی پڑی، جو ایسے لوگوں میں قابلِ قبول اور قابلِ عمل یک جہتی پیدا کرسکیں جو روایت اور انداز فکر کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ان کے دل میں ماضی کی ایسی یادیں ہیں جو لازمی طور پہ گہری یک جہتی پیدا کرنے والی نہیں۔

امریکہ اور کنیڈا دونوں ہی قومی سطح پہ اس سیاسی مقصد میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ کہ وہاں اب ابتدائی دَور کے مقابلے میں زیادہ یک جہتی ہے۔ اس بات کا ذکر مفید ہوگا کہ یہ یک جہتی کیسے

وفاقی حکومت کے قیام سے اس وقت تک سیاسی تدبّر کی رہنمائی اس بنیادی اصول نے کی ہے کہ تمام اہم مسائل کے متعلق ملک کے رہنما ایسی پالیسیاں تلاش کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں جنہیں ملک کے ہر اہم حصّے کی اکثریت کی تائید حاصل ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اسی حد تک ممکن ہے جس حد تک ہم کنیڈا کے تمام باشندوں میں ضبط اور ذمّہ داری کا احساس موجود ہے اور وہ ذہنی لچک اور اخلاقی قدر اس حد تک موجود ہے جو ہمیں دوسرے فرقے کے لوگوں کے نقطۂ نگاہ کو جن سے ہمارا اختلاف ہے سمجھنے کا اہل بنائے اور اس بات کا بھی اہل بنا دے کہ ہم اختلاف کے باوجود اُن کے نقطۂ نگاہ کا احترام کر سکیں۔

کنیڈا کی یک جہتی اگر برقرار رہی ہے اور مستحکم تر ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم کے تمام عناصر کی کافی تعداد میں خود ضبطی کے یہ اوصاف اِس حد تک پیدا ہو گئے ہیں جو پیش آنیوالی مشکلات اور نازک صورتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر آج ہم خارجی معاملات اور دفاع کے معاملے میں ایک مثبت پالیسی پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں، حالانکہ صرف پندرہ سال پہلے بھی ان امور کے متعلق ہم میں گہرے اختلاف موجود تھے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں داخلی طور پر یک جہتی اور اتّحاد بہت بڑی حد تک پیدا ہو چکا ہے۔

یہی صورت امریکہ میں بھی رہی ہے۔ تمہارے ملک کے مختلف عناصر کے درمیان بھی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک میں لڑائی جسے ہمارے فرانسیسی بولنے والے ہموطن "فتح" کہتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارا قومی اتّحاد عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ تمہارے ملک میں لڑائی اُنیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ یہ لڑائی تمہارے ملکی اتّحاد کے عالم وجود میں آنے کے بعد ہوئی جس میں بدقسمتی سے چند سال کے لئے خلل آ گیا تھا۔ اس صورت میں ہمارے ملکوں کے قومی رہنماؤں کو بہ آسانی اور تقریباً جبلّی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مشترکہ اقدامات کے لئے مختلف گروہوں اور عوام کی تائید

طے کرنے کے لئے جو جہاں تک ممکن ہو سکے تمام متعلقہ حلقوں کی خواہش کی تائید حاصل کر سکیں۔ جن سرگرم کوششوں اور ضبط کے مظاہرے کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے سیاسی مدبّر کبھی گریز نہیں کرتے۔ اگر یہ تائید حاصل نہ بھی ہو سکتی ہو تو کم از کم یہ بات تو لابدی ہے کہ تمام عناصر کی ایسی رضامندی حاصل کر لی جائے جو بے دلی اور اکراہ پر نہیں بلکہ رضا اور معاملہ فہمی پر مبنی ہو۔ بڑے اور مختلف العناصر جمہوری ملکوں یا وفاقوں میں اس بات کا لحاظ رکھنا خاص طور پر ضروری ہے کہ کامیاب قیادت صرف ووٹ شماری کے بندھے ٹکے معمول کا نام نہیں۔

جمہوریت میں کامیاب سیاست دانوں کے لئے یہ تربیت ناگزیر ہے کہ جب بھی اُن کے اپنے طبقے یا ملک میں اختلاف کے آثار پیدا ہوں تو انھیں فوراً ہی بلکہ اختلاف رونما ہونے سے پہلے ہی اس کا احساس ہو جائے۔ انھیں صرف اختلاف کا پتہ ہی نہیں چل جاتا بلکہ وہ اس کا مداوا بھی کر دیتے ہیں۔ انھیں یہ تربیت حاصل ہوتی ہے یا کم سے کم ہونی چاہیئے، کہ کوئی بات مُنہ سے نکالنے سے پہلے یہ اندازہ لگائیں کہ ان کے الفاظ کا ان لوگوں پر کیا اثر ہوگا جن کے سامنے وہ جوابدہ ہیں۔

ایک ایسے سیاستداں کے لئے جس کا تصور محدود ہو، یہ لوگ صرف اس کے حلقۂ انتخاب کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں مثلاً اس کے ضلع یا اس کے صوبے کے ووٹر۔ لیکن ایک ایسا سیاستداں جس کی حیثیت کچھ اونچی ہو، جو قومی سطح کا سیاست دان ہو تو وہ کوئی بات کہنے سے پہلے خواہ وہ تیار شدہ تقریر کی شکل میں ہو خواہ اخبار نویسوں کے تقاضوں کے جواب میں، یہ اندازہ بھی لگائے گا کہ اس کے ملک کے مختلف عناصر پر اس کی بات کا اثر کیا ہوگا۔ یہ اندازہ وہ بات کہنے کے بعد نہیں بلکہ پہلے لگائے گا۔ بصورتِ دیگر وہ زیادہ دیر تک قومی سطح کا سیاست دان نہیں رہے گا۔

لیکن اب ایک ایسا دور آ گیا ہے کہ صرف قومی سطح کے سیاستداں بھی کافی نہیں، حقیقت میں صورت یہ ہے کہ وہ لوگ جن کا ذہنی افق یا وفاداری صرف ملکی حدود تک ہو، وہ ایسی باتیں کہہ کر یا ایسا رویّہ اختیار کر کے خود اپنے ملک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جس سے اس کا ملک دوسرے ملکوں کی اس رضاکارانہ اور سرگرم امداد سے محروم ہو جائے۔ جس کی دنیائے موجودہ میں قوی سے قوی ملک کو

ضرورت پیش آسکتی ہے۔

تو صورتِ حال یہ ہے کہ آج اپنی آزاد بین الاقوامی صف بندیوں میں ہمیں جن مشکلات کا سامنا ہے ان کا یہ مطالبہ ہے کہ جمہوری حکومت کے جن طریقوں کو ہم نے ایک مدت تک ملکی حدود کے اندر آزمایا ہے اور جن کی ہمیں مہارت بھی ہے اور تجربہ بھی۔ ان ہی طریقوں کو اب ہم ماضی کے مقابلے میں، وسیع تر رقبے میں اور بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اختیار کریں۔ یہ تقاضے ایسے نہیں جنھیں بہ آسانی پورا کیا جاسکے لیکن ان سے پہلو تہی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ آزاد اور خود دار جمہوری ملکوں کا اتحاد اس یک رنگ اور محکوم سلطنتِ ماضی سے بالکل مختلف چیز ہے جو آمریت کیشوں کے مدِّ نظر ہے۔ جمہوری دنیا میں اتحادی اور حاشیہ بردار دو متضاد اصطلاحیں ہیں۔ اس کا باعث وہ نفرت ہے جو صرف قوت کی بنا پر محکومی، آزاد انسانوں کے دل میں ہمیشہ پیدا کرتی رہے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں اتحاد یا وفاق کو کامیاب بنانا ہے تو ہمیں یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ ہم ایک ایسے ڈھانچے کے اندر رہ سکیں اور اس کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں جو ہماری اپنی ریاست سے وسیع تر ہو۔

یہ تقاضے مختلف لوگوں پر اور یقینی طور پر مختلف قوموں پر مختلف شدت کے ساتھ اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس شدت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے افعال کا دوسروں پر اثر کہاں تک پڑ سکتا ہے۔

سیاستداں، ڈپلومیٹ، جرنیل اور ایڈمرل ان تقاضوں کا تعلق سبھی سے ہے۔ در اصل ان کا تعلق تمام شہریوں سے ہے بالخصوص ان شہریوں سے جن کے منہ سے نکلی ہوئی بات پریس یا ریڈیو کے توسل سے اور بسا اوقات سنسنی پیدا کرنے والے انداز میں چند منٹ کے اندر اندر دنیا کے تمام گوشوں میں پہنچ جاتی ہو۔

بنا ہوں۔ ایک بار میں نے ایک ایڈریس میں یہ بات کہہ دی کہ کئی سال پہلے جب میں شکاگو میں رہتا
تھا تو آرمر اینڈ کو کے ساتھ کام کیا کرتا تھا جو گوشت کو ڈبوں میں بند کرنے والی بہت بڑی کارپوریشن
ہے۔ بہت جلد ایک کمیونسٹ ریڈیو نے میری اس بات کو اس پیرائے میں نشر کر دیا کہ میں نے اتحادی سمجھا
میں اپنی جنگجویانہ سرگرمیوں کا راز یہ اعتراف کر کے منکشف کر دیا ہے کہ ٹینک اور دوسرا سامانِ جنگ
تیار کرنے والی ایک کارپوریشن کے ساتھ میرے مالی مفاد وابستہ ہیں۔ لوگوں کے پبلک بیانوں کی
نامہ نگارانہ شکل اتنی دلچسپ ہمیشہ ہرگز نہیں ہوتی۔

یک جہتی کے یہ حوصلہ آزما مطالبے پورے کرنا اور ان مراعات اور تاخیروں کا جو اس یک جہتی
کو پیدا کرنے کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں خوگر ہونا اس قوم کے لئے بدیہی طور پر مشکل ہے جو قوی ترین
ہو کیونکہ یہ بات قدرتی بھی ہے اور بجا بھی نہیں کہ قوت خود اعتمادی کی حوصلہ افزائی کرے
اور اس رجحان کو فروغ دے کہ دوسروں کی رضامندی کو طے شدہ فرض کر لیا جائے۔ میرا خیال
ہے کہ اس معاملہ میں بھی ہمارا گھریلو تجربہ بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔

جمہوریت کا جوہر یہ ہے کہ اقتدار کو رضامندی اور قوت اور اثر کو ذمہ داری کے
ہم معنیٰ سمجھا جائے۔ دراصل جمہوریت کی تاریخ اس طویل اور مشکل جد و جہد کی روداد ہی کا
نام ہے جس کی بدولت ہم نے اس منزل تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہ ہماری ان کامیابیوں
اور ناکامیوں کی سرگذشت ہے جن کا ہمیں اقتدار کو رضامندی اور قوت اور اثر کو ذمہ داری
کے مترادف سمجھنے کے عقیدے سے پیدا شدہ مسئلوں کو حل کرنے کے سلسلے میں ایک مدت تک
سامنا ہوا۔ جس حد تک کسی ملک کے اندر کچھ افراد یا طبقوں کے رسوخ اور اقتدار کی مقدار، ان
کے ذمہ داری اور دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرنے اور ماننے کے مقابلہ میں زیادہ ہے اسی حد
تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت صرف ایک لفظ ہے جسے تا حال عملی جامہ نہیں
پہنایا گیا۔ اسی اصول کا اطلاق ان قوموں کے مراسم پر بھی ہونا چاہیئے جو مشترکہ اور مستحسن

اس قسم کے گروپ کے جو ممبر نسبتاً کمزور ہوں گے ان کا طاقتور ملکوں کے رویّے اور ان کی پالیسیوں کے متعلق ذی حِس ہونا بے وجہ نہیں اور قابلِ فہم ہے۔ عام حالات میں انھیں اس بات کا بھی زیادہ گہرا احساس ہوگا کہ اس بڑے سماج میں جس کا وہ ایک حصّہ ہیں نفاق پیدا ہونا خطرے کا باعث ہے۔

یہ سب درست سہی لیکن ان ملکوں کو قیادت کی گراں باریوں اور مشکلات کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تشویش جائز سہی لیکن اپنے قوی تر دوستوں کی قوت کے متعلق مریضانہ رجحان نہیں ہونا چاہیئے، چھوٹے ملکوں کی نکتہ چینی دانشمندانہ، تعمیری اور مفید بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ عیب جوئی کا رنگ اختیار کرکے ضرر رساں بھی ہو سکتی ہے۔

اس بات کا اندازہ کرنے کی اہمیت بھی بہت ضروری ہے کہ نکتہ چینی کا پبلک طور پر اظہار کن حالات میں مناسب اور ضروری ہے اور کن حالات میں یہ صرف نفاق پیدا کرنے اور گروپ کو اندرونی طور پر کمزور کرنے کا باعث ہوگا۔ نازک صورتِ حال میں پیچھے کی نشست پر بیٹھ کر سیاست کی گاڑی چلانا گھبراہٹ اور خطرے دونوں کا باعث بن سکتا ہے۔ میں نے پچھلے دنوں ایک کارٹون دیکھا تھا جو گاڑی کو غلط چلانے اور پچھلی نشست سے ڈرائیور کو ہدایت دینے دونوں کے خطروں کو بہت اچھی طرح ظاہر کرتا تھا۔ اس کارٹون کے نیچے یہ عبارت درج تھی "میں نے تم بچوں سے کتنی بار کہا ہے کہ جب ابّا موڑ کو عبور کر رہے ہوں تو انھیں گھبرایا نہ کرو۔"

اتحاد میں شامل ہونے والے نسبتاً کمزور ملکوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کا بے روک اظہار کریں اور اپنی انفرادیت اور آزادانہ فیصلے سے دست بردار نہ ہوں جو نامناسب بھی ہے اور ناممکن بھی۔ لیکن انھیں تناسب اور معاملہ فہمی کے احساس کو کبھی خیرباد نہیں کہنا چاہیئے اور اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ قیادت کو قبول کرنے اور قوت کا حامل ہونے کی وجہ سے بڑی طاقتوں کو خاص رسوخ کا حق حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا وفاق کے مشوروں میں ان کی رائے کو

ہمارے وفاق کے ان ممبروں پر جنھیں نمایاں فوقیت کی بنا پر قیادت کا منصب ملا ہے، یہ
خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ضبط، برداشت اور تحمل کے ایثار کیشانہ اوصاف پیدا کریں۔
اور دوسروں کی آراء کا مناسب احترام کریں۔

وفاق کی کامیابی کے لئے ان ضروری عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔
اس کے لئے مؤثر مشینری کی ضرورت ہے اور اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ مشترکہ
پالیسیوں کو چلانے اور اُن کے متعلق مشورہ کرنے کا حقیقی ارادہ موجود ہو۔ جمہوری ملکوں کے سیاسی
لیڈروں کے لئے جنھیں گھریلو طور پر ان باتوں کے کافی تجربے ہیں۔ ایسا کرنا نسبتہً آسان ہونا چاہیئے
اس معاملے میں بھی قومی مثال برجستہ اور موزوں ہے۔

جب قوم کو کوئی اہم قدم اُٹھانا ہو تو تمام متعلقہ لوگوں کے ساتھ مناسب اور بر وقت
مشورہ جمہوری سیاست دانوں کا مسلمہ طریق کار ہے۔ ہر وہ شخص جسے جمہوری عوامل کی کارفرمائی
کا تجربہ ہے خواہ وہ کمیٹیوں اور کابینوں میں ہو، خواہ ٹریڈ یونینوں یا ڈائرکٹروں کے بورڈوں کی
میٹنگوں میں، اِس بات کو بخوبی جانتا ہے یا بہت جلد جان جاتا ہے کہ اپنے ممتاز ساتھیوں کو اس
صورت حال سے دوچار کرنے سے پہلے کہ وہ کسی نئے مسئلے پر اپنے فیصلے کا پبلک طور پر اظہار کریں۔
اُن سے پرائیویٹ طور پر مشورے کر لینا بہت مفید ہے۔



یہ طریقے ریاستوں کے وفاق میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں انھیں ہمیشہ اپنایا نہیں
جاتا لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اس طرف قدم ضرور بڑھا رہے ہیں۔ ہم اپنے تعاون کے طریقوں کی
اصلاح کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم خیالات کے تبادلے کی زیادہ عادت ڈال
رہے ہیں۔ ہم ابتدائی بات چیت کی قدر و قیمت کا احساس اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ یہ عمل کا نعم البدل
ہے بلکہ اس لئے کہ یہ متحدہ اقدام کے لئے ضروری ہے۔

یہ کہنا غالباً غیر ضروری ہے کہ مشورے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ پہلے سے طے شدہ
فیصلوں پر عمل درآمد میں اپنی ذمہ داری کی حدیں متعین کرنے کا موقع حاصل کیا جائے۔ مشورے کا مطلب

یہ ہے کہ خیالات کے تبادلے میں شرکت کا واقعی موقع ملے، مسئلے کے تمام پہلوؤں اور نفع و ضرر کا پورا پورا اندازہ کیا جائے اور اس کے بعد ایک ایسی پالیسی طے کی جائے جو زیادہ سے زیادہ اتفاق اور ہم آہنگی کی آئینہ دار ہو۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو مختلف مفادوں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو اِن تجاویز کو جو کسی ایک حکومت کے ذہن میں ہوں، مناسب ترمیم کے بعد ایک ایسی موزوں شکل دے دیتا ہے جس سے اس بڑے سماج کی وحدت میں جس کے ہم سب ممبر ہیں خلل پیدا ہو جانے کا امکان بہت کم ہو جائے اور اس کے استحکام کے امکان بہت بڑھ جائیں۔

ایک ایسے گروپ سے جس میں شامل ہونے والی ریاستوں کی قوت اور ان کے رسوخ میں ایسا فرق ہو جیسا کہ ہمارے اٹلانٹک وفاق کے ممبروں میں ہے، اس قسم کی فرمائش بہت کڑی معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ فرمائش واقعی کڑی ہے اور اس کی تکمیل میں وقت لگے گا۔ ایک بحران یا نازک صورتِ حال مثلاً زمانۂ جنگ میں اس سے نرم تر مطالبہ بھی کافی سمجھا جا سکتا ہے اور عارضی طور پہ کافی ہو بھی سکتا ہے لیکن آزاد اقوام کے اشتراک کے استحکام اور مختلف جمہوریتوں کے درمیان ایک ایسا گہرا اور مضبوط اتحاد قائم کرنے کے لئے جو خطرے اور دہشت کے اس بین الاقوامی ماحول کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہو جس میں ہم ایک مدت تک رہنے کے لئے مجبور ہو سکتے ہیں، موزوں طریقہ بالآخر یہی اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم باہمی مشورے کی ضرورت کو مکمل طور پہ تسلیم کر لیں اور اس مقصد کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی مناسب مشینری قائم کریں بلکہ اس مشینری کا باقاعدہ استعمال بھی کریں۔

یہ وسیع تر ذمّہ داری اس براہِ راست ذمّہ داری کو جو ہر جمہوری حکومت کو اپنی قوم کے تئیں ہوتی ہے نہ تو کسی معنیٰ میں ختم کرتی ہے اور نہ اسے کوئی ضعف پہنچاتی ہے۔ یہ وسیع تر ذمّہ داری اس ذمّہ داری پر مستزاد ہے۔ یہ معاملہ مختلف حکومتوں کے درمیان رسمی معاہدوں سے اتنا زیادہ تعلّق نہیں رکھتا۔ در اصل یہ ایک رویّہ ہے جسے ذمّہ دار لوگوں کو اپنانا چاہیئے۔ یہ اندازِ نظر کا ایک

چاہیئے جن کے خیالات اور افعال سے رائے عامہ تشکیل پاتی ہے۔

مشورت کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ڈپلومیٹک سفارتوں کے علاوہ جو ہر حکومت دوسری حکومتوں کی راجدھانیوں میں قائم کرتی ہے، اب ہمارے پاس کچھ مخصوص ادارے بھی ہیں، مثال کے طور پر نارتھ اٹلانٹک کونسل۔ اس کونسل نے اپنے مستقل نمائندوں کے ذریعہ جو کام کیا ہے وہ حوصلہ افزا بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن کی جو میٹنگیں معیّن وقفوں کے بعد وزارتی سطح پر ہوتی ہیں جن میں ممبر ملکوں کے وزرائے خارجہ اور کبھی وزرائے دفاع اور وزرائے مالیات بھی شریک ہوتے ہیں، ایک مشکل تر مسئلے کو سامنے لاتی ہیں۔ بسا اوقات اس سطح کی میٹنگیں صرف ایک یا دو دن جاری رہتی ہیں اور اس وقت کا کافی حصہ یا تو تقریروں میں صرف ہو جاتا ہے اور یا اعلان کے مسودے پر غور کرنے میں۔ شامل ہونے والے وزیر وقت کی پابندیوں کے اتنے ہی غلام ہوتے ہیں جتنا کوئی نو آموز رپورٹر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیصلے درج کرنے کے لئے زبان کی مکمل صحت کی اہمیت ثانوی حیثیت کر لیتی ہے اور زیادہ اہمیت اس ضرورت کو حاصل ہو جاتی ہے کہ دو گھنٹے کے اندر اندر ہوائی اڈے پر پہنچا جائے تاکہ ہزاروں میل دور اپنے ملک میں آئندہ روز جس تقریب میں شرکت کرنا ہے اس میں بروقت پہنچا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور گذشتہ چند سال میں ایسا ایک سے زائد بار ہوا ہے کہ بعض ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے بہ آسانی بچا جا سکتا تھا۔ اگر شرکاء کے درمیان محتاط اور دقّت طلب بحث و تمحیص کے لئے زیادہ وقت ہوتا اور ان فیصلوں کا جو یا تو ہو چکے تھے اور یا جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہو چکے ہیں ایسا درست اور صحیح اندراج کیا جاتا جو متّفقہ ہو۔

لیکن مشاورت بہرحال حصولِ مقصد کا صرف ایک ذریعہ ہے تو پھر مقصد کیا ہے؟

آج یہ مقصد اپنی تہذیب بلکہ خود اپنے وجود کا تحفظ ہے، اس سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

اس نازک صورتِ حال میں اس بقاء کا انحصار کافی حد تک اس بات پر ہوگا کہ جو مخصوص علاقے

حکومت ہیں وسیع تر نظام سے متعلق ہونے کا احساس اور اس کے تئیں وفاداری کا جذبہ کتنا
گہرا ہے۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کی طرح وُہ وقت پھر کبھی نہیں آئے گا
کہ یورپ کی آزاد حکومتوں اور باشندوں کو ایک بار پھر یہ فیصلہ کرنا پڑ جائے کہ وہ دونوں
باتوں میں سے کس بات کو منتخب کریں۔ ہتھیار ڈال دینا یا ہر ممکن فوری خطرے کے باوجود
آزادی کی حمایت میں مضبُوطی سے ڈٹے رہنا۔ اگرچہ ہمیں یہ اُمید رکھنی چاہیئے کہ ان آزمائشوں
کا پھر سامنا نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ ان سے بچنے اور
ان پر قابو پانے میں کامیابی کا انحصار صرف انفرادی قوموں کی قوت اور عزم پر ہی نہیں، بلکہ
اس بات پر بھی ہوگا کہ وفاق کے لیڈروں اور عوام کے درمیان آزاد انسانوں کی وسیع تر
برادری کے تئیں وفاداری جیسی غیر ثقیل باتوں کو کس حد تک فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اگر وفاق یا صِرف تعاون ہی کو مضبُوط اور پائیدار ہونا ہے۔ تو اس قسم کی باتوں کیلئے
الگ الگ خانے نہیں بنائے جا سکتے۔ امریکہ اور کنیڈا کے موجُودہ مراسم اس کی ایک مثال ہیں، یہ
دونوں ملک دوست اور اچھے پڑوسی ہیں لیکن ایسی صُورتِ حال کو قبول کرنا مشکل تر
ہوتا جا رہا ہے اور بہت جلد ناممکن بھی بن سکتا ہے کہ ہماری سرحد جس کے متعلق بہت سی
غیر محتاط باتیں کہی جا چکی ہیں دفاع کے مقاصد کے لئے تو ناپید ہو جائے لیکن محصول، تجارت
اور دوسرے اقتصادی مقاصد کے لئے یہ بہت نمایاں ہو۔ یہی افسوسناک صورتِ حال وفاقوں
کے اندر بھی پیدا ہو سکتی ہے اگر اسلحہ کو بہت زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے برادری کے جذبے
کی نشو و نما کو یا تو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا اور یا اس معاملے میں سست گامی کا ثبوت دیا گیا۔

جمہوریت ایک ایسا سیاسی نظام کبھی نہیں رہی جسے چلانا آسان ہو۔ اپنے شہریوں
بالخصوص اپنے سیاسی مدبّروں سے اس کے تقاضے بہت کڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ بین الاقوامی سطح
پر پھیلتی ہے تو اس کے تقاضے بھی اسی اعتبار سے بڑھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل یقینی

اِتنی وسیع سطح پر سامنا ہوگا۔ میرے اس جذبے کی بُنیاد کہ وُہ اس کی اہل ہے اس اعتماد پر ہے کہ جمہُوری قوموں کے لیڈر اور اُن کے عوام یہ استعداد رکھتے ہیں کہ نئی صورتوں کے تقاضوں کے مطابق اُوپر اُٹھ سکیں اور اس عظیم تر خود ضبطی کو قبول کر سکیں جو ایک ایسی دُنیا میں جہاں ہر قوم کا وجُود دُوسری پر منحصر ہے آزادی کے تحفّظ کے لئے ضروری ہے۔

---

چوتھا باب

# کھلی ڈپلومیسی ـــــ منظرِ عام پر گفت و شنید

پہلی عالمگیر جنگ کے گرم ماحول میں صدر ولسن نے اس نعرے کی ابتدا کی "کھلے معاہدے جو کھلے طور پر کیے جائیں" ان کی بات میں نصف سچائی ضرور تھی کیونکہ ان کے علم کے بغیر عوام کو خفیہ معاہدوں کے ذریعہ پالیسی کے معاملے میں کسی بات کا پابند بنا دینا بُرا ہے اور اس کی مذمت کی جانی چاہیے۔

لیکن ان پالیسیوں کی تکمیل کے لئے جو بذاتِ خود مشہور ہیں اور انھیں پبلک کی تائید بھی حاصل ہے، ٹیکنیکل نوعیت کے خفیہ معاہدے جائز ضرور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس برِاعظم کے دفاع کے لئے امریکہ اور کینیڈا میرے ملک کے شمالی حصے میں حملے کے بروقت انتباہ کے لئے برقی اور مقناطیسی لہروں والے پردے تیار کرنے کے معاملے میں تعاون کر رہے ہیں اس تعاون کا واقعہ اور وہ عام اصول جن کی بنا پر لاگت اور کارکردگی کے معاملے میں یہ ملک آپس میں تعاون کریں گے ایسے امور ہیں جن سے عام پبلک کو بجا طور پر آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے ٹیکنیکل انتظامات کہ یہ آلے کہاں قائم کئے جائیں گے، ان کی رسائی کہاں تک ہوگی، ایسی تفصیلیں ہیں جن کا بسا اوقات پبلک کے علم میں لانا مناسب نہیں ہوتا۔ اس مشروطیت کا ذکر میں کھلے معاہدوں کے اصول میں استثنا قائم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کی وضاحت کے لئے کر رہا ہوں۔

صدر ولسن کی یہ تجویز کہ معاہدے کھلے ہوں اور ان کی تکمیل کھلے طور پر کی جائے

لیکن دانشمندانہ کتاب "ڈپلومیٹک طریقے کا ارتقا" میں ایک فرانسیسی ڈپلومیٹ جولیس کمبون کا حوالہ دیا ہے جو اس صدی کے ابتدائی برسوں میں کافی ممتاز تھا۔ اس ڈپلومیٹ کا قطعی قول یہ ہے کہ "جس دن رازداری ختم ہو جائے گی، اُس دن سے معاہدے کی کوئی بھی بات چیت ناممکن ہو جائے گی" یہ بات غالباً بہت زیادہ ہمہ گیر انداز میں کہی گئی ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جسے پبلک ڈپلومیسی سے کچھ تعلق رہا ہے میں اس کی قوت کو تسلیم ضرور کرتا ہوں۔

ہم مغربی اس شیخی کے عادی ہیں کہ اس چیز پہ بہت زیادہ توجہ دینا جسے "ظاہرداری" کہا جاتا ہے ایک ایشیائی وصف ہے لیکن جمہوری حکومتوں اور انفرادی سیاست دانوں کیلئے جنھیں وقتاً فوقتاً انتخاب جیتنے پڑتے ہیں، وقار کی اہمیت بھی مسلمہ ہے اور بسا اوقات اس پہ بہت زیادہ زور بھی دیا جاتا ہے۔ وقار کا لفظ ہم ظاہرداری کے معنیٰ میں ہی استعمال کرتے ہیں۔ شاید کبھی وہ دن ضرور آئے گا کہ جمہوری ملکوں میں ہر شخص اتنا بالغ نظر، دانشمند اور روادار ہو جائے کہ وہ ظاہرداری کے پیچھے مکمل صداقت کو بے کم و کاست دیکھ سکے اور سچائی کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ کر سکے لیکن وہ وقت ابھی آیا نہیں۔ اگر یہ وقت آگیا تو نہ تو غازہ بنانے والے ہی اتنے سرگرم رہیں گے اور نہ پبلک تعلقات کے ماہروں کو ہی اتنا مصروف رہنا پڑے گا۔ جب تک کہ وہ وقت نہیں آتا اُس وقت تک اگر ڈپلومیٹک نمائندوں کو اس حکمت سے کام لینے کی آزادی ہے جو معاہدے طے کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہے اور ظاہرداری کا بھی مناسب لحاظ رکھنا ہے تو بسا اوقات یہ بات موزوں ہوتی ہے کہ گفت و شنید پردے کے سامنے کی بجائے اس کے پیچھے ہو۔

اگر بین الاقوامی کانفرنس میں شامل ہونے والے کسی ملک کے مندوبین کو کڑی ہدایتیں دی جائیں اور ان ہدایتوں کو قبل از وقت دنیا میں مشہور بھی کر دیا جائے تو اس سے شدید مشکلات بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن چیزوں کو خیرباد کہنا انتہائی مشکل ہوتا ہے [illegible]

پالیسی سے آگاہ کرے اور جن باتوں کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اُن میں مشکل ترین ریڈیو یا اخبار کے اس پنڈت کی برہمی ہوتی ہے جو اس پالیسی کو انتہائی دانشمندانہ قرار دے کر یہ لکھ چکا ہو کہ وہ ہمیشہ اس کی حمایت کرتا رہا ہے اور پھر یکایک اُسے یہ علم ہو جائے کہ یہ پالیسی تبدیل ہو گئی ہے۔

کھلی ڈپلومیسی کی مشکلوں میں ایک مشکل یہ ہے کہ عوامی جذبے کے جوش میں آجانے کی وجہ سے صرف گفت و شنید کی نوعیت ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد ہی مبہم ہو کر رہ جائے۔

گفت و شنید کا مقصد مفادات میں مصالحت پیدا کرنا ہے۔ یہ کسی ایسے پہلو کو تلاش کرنے کی کوشش ہے جہاں بنیادیں مشترک ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ باہمی مفاہمت سے سمجھوتے کے مواقع تلاش کئے جائیں۔ اگر گفت و شنید کرنے والوں کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ جوں ہی وہ فریقِ ثانی کو کوئی رعایت دیں گے یا اپنے مطالبات کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ کریں گے اس کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر اُسے اخبار یا ریڈیو کے ذریعہ اُن کے ملک میں سپر اندازی کے رنگ میں پیش کر دیا جائے گا تو اس قسم کی مفاہمتیں صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی بن سکتی ہیں۔



اس سے پہلے کی ایک صدی کے ایک ڈپلومیٹ دی کالیرٹس نے ہمیں اس معاملے میں بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"گفت و شنید کا راز متعلقہ فریقوں کے حقیقی مفادات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ دہشت سے گفت و شنید کو ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے کیونکہ دہشت بسا اوقات کسی فریق کو وہ انتہائی پوزیشن لینے پر مجبور کر دیتی ہے جسے وہ اشتعال کے بغیر اختیار نہ کرتا۔ اس کا سبھی کو علم ہے۔ کہ مجروح پندار بسا اوقات لوگوں کو ایسے راستے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جن سے اپنے مفادات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کے بعد وہ گریز کرنے لگیں جو کامیابی قوت یا دھوکے سے حاصل

کامیابیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے"۔

لیکن جہاں یہ سچ ہے کہ گفت و شنید کا مقصد متضاد مفادات میں مفاہمت پیدا کرنا ہے وہاں یہ امر بھی بین الاقوامی سیاسی زندگی کی سنگین حقیقت ہے کہ مختلف ملکوں کے کچھ مفاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے شدّت کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔ جو لوگ اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہیں یا اس کے مقابلے میں یہ انتہائی پوزیشن لیتے ہیں کہ پالیسی کے فرق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف سچائی ہی سچائی ہے اور دوسری طرف جھوٹ ہی جھوٹ، وہ ایک غیر حقیقی دنیا میں رہتے ہیں۔ کسی پالیسی کی تشکیل میں اس قسم کے لوگوں کے اوہام اور دہشت آفرینی کو جس حد تک دخل ہوگا، اسی حد تک وہ تباہی پر منتج ہوگی۔ جن عظیم ترین خطروں کا آج ہمیں سامنا ہے ان میں ایک خطرہ بلاشبہ یہ بھی ہے۔ یہ چیز اس مفاہمت میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور اسے ناکام بناتی ہے جو گفت و شنید کا بنیادی مقصد ہے۔ اس قسم کی گفت و شنید کو ایک بار مسٹر جارج کینن نے "ڈپلومیسی کے تقریباً تقریباً گم شدہ آرٹ" کا نام دیا تھا۔

سنجیدہ قسم کی گفت و شنید میں اگر آپ کسی اطمینان بخش اور عزت مندانہ مفاہمت پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ سپر اندازی نہیں بلکہ فتح ہے۔ ایسا اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے جہاں فریقِ ثانی امکانی دشمن ہو، بشرطیکہ آپ نے عزت یا کسی بنیادی مفاد سے غداری نہ کی ہو۔ اس صورت میں سمجھوتے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ دشمنی کو رواداری میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ اس امید میں کیا جاتا ہے کہ رواداری آگے چل کر تعاون کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

امکانی دشمنوں کے ساتھ گفت و شنید کے دوران ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ارادتاً جارحانہ حملے کے علاوہ جس کا خطرہ ہمیشہ موجود ہے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ کشیدگی اور دہشت کی شکار دنیا میں اتفاقی جنگ کا آغاز ہو جائے۔ ایک دوسرے کے ارادوں کے غلط اندازے، انھیں غلط طور پر سمجھنے یا ان سے غلط طور پر خوف زدہ ہونے کی وجہ سے ایسی لڑائی کا شروع ہو جانا بالکل قابلِ فہم

حالات میں لچک کا وہ فقدان جس کی کھلی گفت وشنید حوصلہ افزائی کرتی ہے سخت ہو کر مکمل [illegible] کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

- اگر دورِ مشرق یا وسطِ مغرب میں سے کسی ایک کو ناراض کرنے کی نوبت آ ہی جائے تو اس صورت میں آسان ترغیبات یہ نظر آئے گی کہ وسطِ مغرب کے مقابلہ میں دورِ مشرق کو ناراض کردے خواہ اس کے دور رس نتیجے نسبتاً زیادہ خطرناک ہوں۔

لیکن ڈرپوک ڈپلومیٹ یا سیاسی گفت وشنید کرنے والے کا حوصلہ بڑھانے کے لئے یہ یاد دلانا مناسب ہے کہ جہاں ۱۹۵۵ء میں رائے عامہ اس کی عمل کی آزادی کو محدود کرتی ہے وہاں لوئی چہاردہم کے مطابق اسے صرف عمل کی آزادی ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ سے بھی محروم کر سکتے تھے۔ اگر آج رائے عامہ کے دباؤ کا مناسب لحاظ رکھنے میں ناکامی ملازمت یا انتخاب کو خطرے میں ڈالتی ہے تو لوئی چہاردہم کے دور میں اس قسم کی ناکامی مہلک بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی ضرب براہِ راست گردن پر پڑتی تھی۔ یہ جو فرق پیدا ہوا ہے اسی کا نام ترقی ہے۔

جدید دنیا میں اس ڈپلومیٹک گفت وشنید کو سب سے زیادہ شہرت ملتی ہے، اگرچہ یہ سب سے زیادہ اہم نہیں ہوتی، جو مخصوص سیاسی مقاصد کے لئے بلائی گئی مخصوص ایڈہاک کانفرنسوں میں کی جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ نیا نہیں لیکن گذشتہ نسلوں کے مقابلے میں آج اس کا استعمال زیادہ کثرت سے ہوتا ہے اس کی وجہ جزوًا یہ ہے کہ بہت سے موجودہ مسائل کو حل کرنے کے لئے دو فریقوں کی بجائے دو سے زائد فریقوں کے درمیان گفت وشنید زیادہ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ تبدیلی بہت اہم ہے۔ اگرچہ یہ مشکلات اور مایوسیوں کی طرف بھی لے جا سکتی ہے جیسا کہ جنگ کے فوراً بعد کے چند سال کی تاریخ سے ظاہر ہے۔

مخصوص کانفرنسیں اس اعتبار سے ایک مؤثر اور قابل قدر فرض انجام دیتی ہیں کہ وہ مختلف ملکوں کے متعدد نمائندوں کو ملاقات اور گفت وشنید کا موقع مہیا کرتی ہیں۔ ان میں سے

... بہرحال یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے
کہ اس قسم کے مفید نتائج تقریباً لامحالہ طور پر ایک واحد کانفرنس کا نہیں بلکہ کانفرنسوں کے ایک سلسلے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر کانفرنس بالعموم چند ہی دن جاری رہتی ہے۔ اس سے پہلے ڈپلومیٹک ذرائع سے خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ کانفرنسوں اور اسی قسم کی ابتدائی بات چیت کا مجموعی سلسلہ کئی ماہ اور کبھی کبھی برسوں پر پھیل جاتا ہے۔

ان تمام معاملوں میں کامیابی کی شرط یہ تھی کہ مشترکہ مفاد متقابل مفادات پر غالب تھا اور شرکاء کے دل میں مثبت نتائج پر پہنچنے کی تمنا مشترک تھی۔ ان کامیابیوں کے لئے اس امر کی لامحالہ ضرورت ہوتی ہے کہ وزیروں اور افسروں کی طرف سے بڑی احتیاط کے ساتھ طویل ابتدائی کام کیا جائے۔ اس کام کا بہت سا حصہ رازدارانہ طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب اس کانفرنس سے بہت مختلف چیز ہے جو شک اور اعصابی کشیدگی کے ڈرامائی ماحول میں منعقد ہو، جس کا ڈھنڈورا خوب پیٹا جائے لیکن اس کی تیاریاں عدم تکمیل ظاہر کرتی ہوں، جس میں اس بات کے مقابلے میں کہ اس سے اچھے نتائج پیدا ہوں زیادہ اہتمام اس کا کیا جائے کہ پبلک اس میٹنگ کو ہی قبولیت سے سرفراز کر دے۔

اس قسم کی صورتیں واقعی ممکن ہیں اور بسا اوقات وہ مشکل اور اہم بھی ہو سکتی ہیں جن میں اس قسم کی شہرت یافتہ میٹنگیں گفت و شنید کا سب سے کم تسلی بخش طریقہ ہوں۔ جب تمام دنیا کی توجہ صرف ایک "چوٹی کی گفت و شنید" پر مرکوز ہو کر رہ جائے تو اس سے ڈرامائی ماحول لازمی طور پر پیدا ہو جاتا ہے، تعلقات عامہ کے افسر کے لئے اس قسم کا ماحول کتنا ہی دلفریب ہو لیکن گفت و شنید کرنے والے کے لئے یہ بدبختی کی علامت ہے۔ جہاں پبلک کے جذبات اور اس کی توقعات کو بہت زیادہ بیدار کر دیا گیا ہو وہاں فکر و تحمل کو کند ذہنی اور سمجھوتے کو سپر اندازی سے خلط ملط کرنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ڈپلومیسی ...

تو اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ لوگ اس کام میں تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور بالعموم وہ ہر اٹک کے بعد
سکور کا اعلان کئے بغیر ہی گفت و شنید کو جاری رکھ سکتے ہیں اور انہیں اس میں راحت بھی ملتی ہے۔

• اگر حکومتیں سرکاری اور ڈپلومیٹک ذرائع سے کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں ناکام ہو جائیں، تو اس کے بعد بھی اپنی کوششوں کو جاری رکھ سکتی ہیں اور بڑی سے بڑی بات یہ ہو سکتی ہے کہ کسی شور و شر کے بغیر ناکامی پر قناعت کر لی جائے لیکن جب امور خارجہ کے وزیروں اور اس سے بھی زیادہ جب حکومتوں کے صدروں کی ملاقات ہو رہی ہو، ملاقات کرنے والوں کے ساتھ پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے عملے ہوں، ماہر ہوں، بحیثیت مشیروں کے مشیر بھی ہوں، پس پردہ کام کرنے والے چالاک لوگ بھی ہوں اور یہ در پردہ کام کرنے کے لئے پردے مہیا کرنے والے چالاک تر لوگ بھی ہوں تو معاملات میں انتشار اور مشکلات کے پیدا ہو جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

اندریں حالات یہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ اگر ان میٹنگوں میں جن پر پبلک کی امید اور توقعات کو مرکوز کر دیا گیا ہو کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں ناکامی رہے تو اسے لازمی طور پر اس امر کا ثبوت سمجھ لیا جائے کہ سمجھوتہ کبھی ممکن ہی نہیں۔ اس کا ردّ عمل اپنے طور پر غیر ضروری مایوسی اور تشویش کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ زبردست رجحان ہے کہ عدم اتفاق کی حقیقت کو چھپایا جائے یا اس سے انکار کیا جائے اور یا سارا زور اس بات کو ثابت کرنے پر صرف کر دیا جائے کہ قصور فریقِ ثانی کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ناکامی یا کم از کم نامکمل کامیابی کی وضاحت کرنے کے لئے اس قسم کے فقرے سیاسی گفت و شنید کرنے والے کے کامیاب ہتھیار بنتے جا رہے ہیں کہ "بات چیت میں مسئلے کے ہر پہلو پر صاف گوئی سے تبادلۂ خیال ہوا" اور اس میں "مفاہمت کے تمام امکانات تلاش کئے گئے" نتیجے کے طور پر "فریقین ایک دوسرے کی پوزیشن کو واضح طور پر سمجھنے لگے ہیں"۔

پانچواں باب

# کھلی ڈپلومیسی — اقوام متحدہ

آج کل ایک نسبتہً نئی ڈپلومیسی منظرِ عام پہ آئی ہے جو اس پیشے کے بہت سے پرانے اوصاف اور طریقوں کو غصب کر رہی ہے اور جہاں کمزوریوں کی جن کا میں نے ذکر کیا ہے بالخصوص شکار ہو سکتی ہے۔ اس ڈپلومیسی کا ذریعہ اور میدان بین الاقوامی اجتماع ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت بلاشبہ اقوام متحدہ کو حاصل ہے۔ اقوام متحدہ میں ڈپلومیسی نمایاں طور پہ اور بسا اوقات پریشان کن حد تک کھلی ہوتی ہے۔ یہاں پروپیگنڈے کے طوفانوں میں کوئی چیز سدِّ راہ نہیں ہوتی۔ یہاں غلط فہمی اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے بھی راستہ صاف ہوتا ہے۔

لیکن جو لوگ اس کے نامکمل ہونے کی وجہ سے اقوام متحدہ کی مذمت کرتے ہیں وہ دو باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اقوام متحدہ میں سنجیدہ اور رازدارانہ گفت و شنید ممکن ہے اور ہوتی بھی ہے، دوسری یہ کہ ہماری عالمی تنظیم کوئی ایسا اہم تر فریضہ بھی انجام دے سکتی ہے جو گفت و شنید کے مواقع اور اس کی مناسب مشینری فراہم کرنے سے بھی زیادہ اہم ہو۔

جہاں تک پہلے نکتے کا تعلق ہے میں تجربے کی بنا پر اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ اس قسم کی تعمیری ڈپلومیٹک سرگرمیاں اقوام متحدہ کی عمارت واقع منہاٹن کے اندر اور اس کے قرب و جوار میں ضرور ہوتی ہیں لیکن پبلک کانفرنسوں کے کمروں میں تقریباً کبھی نہیں ہوتیں۔ اس قسم کی گفت و شنید کے مواقع اور سہولتیں نسبتہً ڈیلی گیٹوں کی نشستگاہ، مستقل ڈیلی گیٹوں

مقصد کے لئے عاریتہً حاصل کر لئے جاتے ہیں بشرطیکہ وہاں کوئی سرکاری میٹنگ نہ ہو رہی ہو۔ ایسٹ دریا کے ساحل کے باغ کی رَوشیں اور آس پاس کے ریستوران بھی اس قسم کی بات چیت کے لئے مناسب جگہ ثابت ہوتے ہیں۔ قصّہ مختصر یہ کہ کوئی بھی جگہ جو سُننے والے کان، دیکھنے والی آنکھ اور فوٹو لینے والے کیمرے کی زد سے، جن کی اس مرحلے پہ مداخلت اگر گفت وشنید کے عمل کو ناممکن نہیں تو زیادہ مشکل ضرور بنا سکتی ہے، باہر ہو، موزوں ہو سکتی ہے۔

دُوسری بات جسے اقوام متحدہ کی مذمت کرتے وقت نظرانداز کر دیا جاتا ہے بین الاقوامی رَوابط میں اس کے بنیادی کردار سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کردار کو بُنیادی طور پہ پارلیمانی کہا جاسکتا ہے۔

اس پارلیمانی کردار کا تقاضا ہے کہ روایتی ڈپلومیٹک طریقوں کے ساتھ ساتھ کھُلی ڈپلومیٹک بحث کے لئے اقوام متحدہ جیسے اداروں کو بھی قائم رکھا جائے اور ان سے کام لیا جائے۔ اقوامِ متحدہ بحث مباحثے کے ذریعے متحارب اور متقابل بین الاقوامی مفادات کو منظرِ عام پہ لے آتی ہے۔ اس قسم کی بحث [illegible] رازدارانہ گفت وشنید کے ذریعہ مفاہمت کے امکان کا دیباچہ ثابت ہوسکتی ہے جو اگر کامیاب ہو جائے تو قابلِ تشہیر سمجھوتے پر بھی منتج ہوسکتی ہے! اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت اقوام متحدہ کی یہ ہے کہ متقابل مفاد کے اختلاف کے ساتھ ساتھ جن میں مفاہمت اور سمجھوتے سے ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیئے۔ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ دُنیا کی مختلف قوموں اور حکومتوں کے کچھ مفاد مشترک بھی ہیں۔ وہ ان مشترک مفادات کا سُراغ لگانے، پبلک کو ان کا احساس دلانے، اُن پر کھُلی بحث اور اُن کے تحفّظ کا ایک موزُوں ذریعہ ہے۔ ہمیں یہ بھُولنا نہیں چاہیئے، کہ گفت وشنید ڈپلومیسی کا اگرچہ ایک اہم حصّہ ہے لیکن بہرحال صرف ایک حصّہ ہے اس کی کُل کائنات نہیں۔

اِس نکتے کو سمجھنے سے اس غلط فہمی کے ازالے میں مدد مِل سکتی ہے جو اقوام متحدہ کے حقیقی

ہیں۔ اہم بات منہاٹن کی تنظیم کی تاریخ نہیں بلکہ تمام رُوئے زمین کی قوموں اور انسانوں کا ذہنی اور رُوحانی بلوغ ہے۔

انسانی برادری کا ایک زندہ مظہر ہونے کے علاوہ اقوامِ متحدہ نے معیّن اصولوں اور ضابطۂ اخلاق کا ایک چارٹر بھی پیش کیا ہے جس پر عمل پیرا ہونے کا تمام ممبر حکومتوں نے یقین دلایا ہے۔ یہ ضابطہ مکمّل نہیں لیکن مستحسن ضرور ہے۔ بیشتر اخلاقی ضابطوں کی طرح اس کی تعمیل بھی جزواً ہی ہوتی ہے اور تعمیل ضابطہ کے مقابلے میں زیادہ توجّہ ضابطہ شکنی پہ مرکوز رہتی ہے۔

مزید برآں چارٹر نے چند نمائندہ ادارے بھی قائم کیے ہیں۔ ان نمائندہ اداروں کو دُوسرے کارکن ادارے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس طرح ایک زندہ سماجی نظام عالم وجود میں آجاتا ہے جس کے امکانات اگر لامحدُود نہیں تو عظیم ضرور ہیں۔ سیاسی میدان میں شاید ہی کوئی بات ہوگی جو اس چارٹر کے ذریعہ تکمیل نہ پاسکے۔ بشرطیکہ اس کی تکمیل کی آرزو کافی آدمیوں کے دل میں موجُود ہو۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں یہ نمائندہ ادارے — عمومی اسمبلی، سلامتی کونسل، ٹرسٹی کونسل اور اقتصادی تعاون کرنے والا ادارہ — ڈپلومیٹک گفت و شنید کرنے والی کانفرنسوں کے مقابلے میں ایک پارلیمنٹ یا آئین ساز اسمبلی کی حیثیت زیادہ رکھتے ہیں۔ قومی پارلیمنٹوں کی طرح ان اداروں کی قدر و قیمت بھی بہت بڑی حد تک یہی ہے کہ ان کے ذریعہ رائے عامّہ کو حرکت پذیر اور مرتکز کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے ذریعہ اہم اہم نکتہ ہائے خیال کا اظہار کیا جاتا ہے، ان کا ڈرامائی انداز میں تقابل کیا جاتا ہے اور اس طرح ان نکتہ ہائے خیال کو مربُوط شکل میں سامنے آنے کا موقع ملتا ہے۔ مسائل کو پبلک کے سامنے لاکر، ان کا انکشاف کرکے اور اُن کے تاریک گوشوں پہ روشنی ڈال کر اتحادی سبھا منتظم حکّام میں مزید توجّہ اور ذمّہ داری کی حوصلہ

[illegible]
کی کارکردگی کی اصلاح کرتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کا کردار ایک آزاد اور بے لاگ پارلیمنٹ یا کانگریس کے مشابہ ہے۔

قومی حدود کے اندر آئین ساز اسمبلیاں ایک فرض یہ بھی انجام دیتی ہیں کہ قومی مسائل کو پبلک بحث میں ڈرامائی طور پر سامنے لا کر عام لوگوں کی تربیتِ ذہنی کا باعث بنتی ہیں۔ اس قسم کی بحثوں نے مختلف ریاستوں کی تاریخ میں قومی مسائل سے آگاہی اور قومی برادری کے احساس میں اضافہ کر کے بے اندازہ خدمات انجام دی ہیں۔ اسی طرح عمومی اسمبلی اور اقوام متحدہ کے دوسرے ادارے بھی عالمگیر سطح پر اسی قسم کا فرض انجام دے سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کا سلسلہ شروع بھی ہو گیا ہے۔



ایک نکتہ اور بھی ہے۔ جس چیز کو سر ہیرلڈ نکلسن "لاؤڈ سپیکر کی ڈپلومیسی" اور "توہین کی ڈپلومیسی" کہتے ہیں وہ گفت و شنید کے موجودہ ماحول میں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے، واقعی "متضاد اصطلاحیں" ہیں لیکن یہ فقرے ایک صحت مند پارلیمنٹ میں پُرجوش اور جاندار بحث کی آئینہ داری بھی بجا طور پر کر سکتے ہیں۔ وہ "لامتناہی پروپیگنڈائی تقریریں جن کا مخاطب وہ ڈیلی گیٹ نہیں جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے گفت و شنید ہو رہی ہے بلکہ خود اپنے ملک کی پبلک ہوتی ہے"[1] واقعی تھکا دینے والی اور کبھی کبھی اشتعال دلانے والی ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ تقریریں ایک ایسی چیز ہیں جن کا سامنا صرف اقوام متحدہ کے کمرہ ہائے نشست میں ہی نہیں ہوتا بلکہ مجھے شک ہے کہ امریکی کانگریس یا سینٹ کے ہر ممبر، برطانیہ یا کنیڈا کی پارلیمنٹ کے ہر ممبر اور فرانس کے ہر ڈپٹی کو اس کا تجربہ ہے۔ یہ اس قیمت کا حصہ ہے جو جمہوریت کے لئے ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قیمت ابتدائی قسم کی بین الاقوامی جمہوریت میں بھی ادا کرنی پڑتی ہے بلکہ وہاں خاص طور پر ادا کرنی پڑتی ہے۔

---

[1] ہیرلڈ نکلسن کی کتاب "ڈپلومیٹک طریقے کا ارتقاء" مطبوعہ کانسٹیبل اینڈ کو۔ لندن

جمہوری قومی حکومت کے ڈھانچے کے اندر ایسی ہی گفت وشنیدیں ہیں جو پبلک مباحثے
پہلے رازدارانہ طور پر کی جاتی ہیں یا مباحثے کے ساتھ ساتھ جاری رہتی ہیں۔ یہ گفت وشنیدیں جن کا مقـ
بحث وتمحیص، زمین ٹٹولنا یا کسی سمجھوتے پر پہنچنا ہوتا ہے، دفتروں میں کی جاتی ہیں۔ یہ یا تو حکومـ
کے ایک ہی محکمے کے مختلف شعبوں کے افسروں کے درمیان ہوتی ہیں یا مختلف محکموں کی مشترک
کمیٹیوں کے درمیان۔ یہ گفت وشنیدیں مختلف افراد کے درمیان کھانے کی میز پر بھی ہو جاتی ہیں
اگر اُن افراد میں ہر شخص کسی خاص شعبے کا ماہر یا ذمہ دار افسر ہو، یہ گفت وشنیدیں پارٹی کی محدو
کمیٹیوں میں بھی ہوتی ہیں اور قومی کابینوں کے اجلاسوں میں بھی۔

ان تمام اجتماعوں میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے، اُن کی پرائیویٹ نوعیت۔ تخلیہ اور
پردہ داری کسی ناپاک مفہوم کی حامل نہیں وہ صرف دانشمندی کی علامت ہے۔ یہ اصول اور یہ طریـ
نہ تو پارلیمنٹ یا کانگریس کے مختلف قسم کے فرائض میں کسی مداخلت کے مرتکب ہوتے ہیں، اور
نہ اُنھیں کسی اعتبار سے غیر ضروری بناتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی گفت وشنید
کے بعد آئین ساز اسمبلیوں کی ہاؤ ہو اور شور وہنگامہ نہ ہو تو یہ گفت وشنیدیں بے معنیٰ ہوں گی
اور نیابتی حکومتوں کے لئے مہلک ثابت ہوں گی۔

اس کی مثال اقوام متحدہ کے مباحثوں میں بھی ملتی ہے اگرچہ مشابہت مکمل نہیں۔

اقوام متحدہ کے مباحثوں کے بعد جو فیصلے کئے جاتے ہیں اُن میں سے بیشتر یا تو مشورے ہوتے
ہیں اور یا مطالبے۔ لیکن دُنیا کی نسبتہً زیادہ ذمہ دار حکومتیں اُن کے وزن کو تسلیم ضرور کرتی ہیں بعض
فیصلوں کا مقصد عارضی یا مستقل قسم کے کارکن ادارے قائم کرنا ہوتا ہے جن میں کچھ حکومتیں محدود
مقاصد کے لئے رضاکارانہ طور پر شریک ہو جاتی ہیں۔

اب جو حکومتیں اس قسم کے کارکن ادارے قائم کرنا چاہیں یا ان میں شرکت کرنا چاہیں،
وہ اقوام متحدہ میں بحث کے مراحل سے گذرنے اور اس سے اس قسم کے اداروں کے قیام کے حق میں

بظاہر تو اس کی اہمیت [illegible] اقوام متحدہ [illegible]

جائے یا نہیں۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو اس کے فائدے کیا ہیں؟ کچھ فائدے تو ایسے ہیں جن کا تعلّق اقوام متحدہ کی دفتری خدمات کے ساتھ ہے لیکن میرے نزدیک یہ نکتہ بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت کی تشریح بنیادی طور پر اس چیز کو سمجھنے سے ہوگی جسے میں اقوام متحدہ کا اوّلین منصب قرار دے چکا ہوں۔ یہ منصب یہ ہے کہ اقوام متحدہ عالمگیر برادری کا ایک زندہ نشان ہے اور اس نشان کو زیادہ حقیقی اور زیادہ محکم بنانا ہم سب کے لئے مفید ہے۔

چند سال پہلے ایک بین الاقوامی تنظیم کی ضرورت واقعی پیش آگئی تھی جو مغربی یورپ کی آزاد حکومتوں پر مشتمل تھی۔ اس تنظیم کو ان فنڈوں کی تقسیم کرنا تھی جو انہیں مارشل پلان کے ذریعہ ملنا تھے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ مقصد یورپ میں اقتصادی تعاون کی جماعت کے قیام سے حاصل کیا گیا لیکن کیا یہی مقصد اس جماعت کو اقوام متحدہ کے ادارے کی شکل دے کر اتنی ہی آسانی کے ساتھ بہتر طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اقوام متحدہ کا ایک ریزولیوشن پاس کرا کے موجودہ ممبروں ہی پر مشتمل ایک ادارہ قائم کر دیا جاتا۔ یہ ادارہ مکمل طور پر خود مختار ہوتا اور اس ادارے میں ان حکومتوں کو جو اس وقت اس میں شامل ہیں اتنا ہی اثر و رسوخ حاصل ہوتا جتنا اب حاصل ہے۔ اس کے انتظامی شعبے میں بھی موجودہ مردوں اور عورتوں کو ہی مقرر کیا جا سکتا تھا اور ان کے فرائض بھی بے کم و کاست یہی رہتے جو اب ہیں۔ فرق صرف اتنا پڑتا کہ اس ادارے پر اقوام متحدہ کا لیبل لگ جاتا۔ اس قسم کے مقصد کے لئے یہ فرق میرے خیال میں چھوٹا اور معمولی ہرگز نہیں۔ اگر اس کام میں اقوام متحدہ کو نظرانداز نہ کیا جاتا تو آج اس کا وقار اس کے موجودہ وقار کے مقابلے میں زیادہ ہوتا۔ جب ۱۹۵۱ء میں کوریا میں بین الاقوامی پولیس ایکشن کی ضرورت پیش آئی اور اس مقصد کے لئے مسلح افواج حاصل کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے وقار کو استعمال کرنا پڑا تو یہ بات سامنے آگئی، کہ اقوام متحدہ کو ایک بہت بڑے بین الاقوامی اقتصادی منصوبے سے ایک نشان کی حیثیت سے وابستہ کر کے یورپ میں اگر اس کی قوت کو بڑھا دیا گیا ہوتا تو

یہ مثال میں اس طریقِ کار کی تجویز کے طور پر پیش کر رہا ہوں جسے ان تمام جمہوری حکومتوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جو اقوامِ متحدہ کے لئے دنیا کی تمام قوموں کی تائید کو زیادہ وسیع اور زیادہ گہری بنانے کی صدق دلی سے آرزومند ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی ان سرگرمیوں اور کامیابیوں کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا جن کا تعلق سیاسی میدان یا سلامتی کے مسائل سے ہے اگرچہ ہماری جماعت کے مستقبل کے لئے یہ سرگرمیاں اور کامیابیاں مرکزی اہمیت رکھتی ہیں۔ بہرحال میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اقوامِ متحدہ کے سیاسی مباحثوں اور فیصلوں کا واقعات کی آئندہ شکل پر اثر ضرور پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ اثر بہت اہم ہوتا ہے۔ ان فیصلوں کی بنا پر نئی ریاستیں قائم ہوئی ہیں اور پرانی ریاستوں کا تحفظ ہوا ہے یہ جارحانہ حملوں میں بھی مزاحم ہوئے ہیں اور ایک نمایاں مثال تو ایسی بھی ہے کہ جب جارحانہ حملہ ہوا تو اقوامِ متحدہ کا فیصلہ اس کی شکست کا باعث بنا۔



اقوامِ متحدہ کے مباحثوں اور فیصلوں کا وہ اثر بھی کم اہم نہیں جو سیاسی اور اقتصادی میدان میں بین الاقوامی سرگرمیوں میں اضافے کا باعث بنا ہے اور پھر اس کے علاوہ وہ فیصلے ہیں جن کا مقصد افلاس، بیماری، جہالت اور پسماندگی کا مقابلہ کرنا ہے اور اس چیز کا مقابلہ کرنا بھی جسے اقوامِ متحدہ کے حلقوں میں "کم ترقی یافتہ ہونا" کہا جاتا ہے۔

تقریباً دو ہزار سال پہلے ارسطو نے جو سیاسی عوامل کا انتہائی زیرک مبصر تھا، یہ بات کہی تھی کہ ایک بار اگر کسی سماج میں جمہوری طرز کا آئین نافذ کر دیا جائے تو یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ دیر و زود غریب اپنے ووٹ کو اپنی مادی حالت بہتر بنانے کے لئے بطور آلہ استعمال کریں گے۔ مغربی دنیا کی جمہوری قومی ریاستوں میں اس صدی کے دوران بالکل یہی ہوا ہے۔ ولادتِ مسیح سے چار سو سال قبل یونان کی ریاستوں میں یہ صرف ایک رجحان تھا۔

مختلف قوموں کے درمیان بحث اور فیصلے کے لئے ...

کے مقام پر دور مشرق کے مسائل پر جو کانفرنس ہوئی وہ اس کی یقین بخش مثال ہے اگرچہ یہ کانفرنس ضابطے کے اعتبار سے اقوام متحدہ کی کانفرنس نہیں تھی۔

یہ بات ممکن ہے کہ رُکنیت کے ان مشکل سوالوں کو اس طریقے سے حل کر لیا جائے جسے اب "مجموعی فیصلے" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان ریاستوں کی رُکنیت کے مسئلے کو وقتی طور پر ایک طرف رکھا جاسکتا ہے جہاں عملی طور پر دو حکومتیں قائم ہیں اور یہ ریاستیں ان کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی ہیں۔ تقسیم اور نتیجے کے طور پر تقسیم شدہ ریاستوں کے اقوام متحدہ کے رُکن بننے میں تاخیر سرد جنگ کا افسوسناک نتیجہ ہے لیکن یہ عارضی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی تسلیم کر لینی چاہیئے کہ مجموعی فیصلے کے خلاف جو بالغ نظرانہ اعتراض ہے اس کا تعلق درحقیقت اس بات سے نہیں کہ مختلف مسئلوں کی پوٹلی کیوں بنائی جائے بلکہ اصل اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس پوٹلی کے اندر ہے کیا؟ مجموعی فیصلے دراصل سمجھوتے یا عوض معاوضے کا دوسرا نام ہیں۔ یہ دراصل اس طریق کار کا دوسرا نام ہیں جو اختلافِ مفاد کی صورت میں آگے بڑھنے کے لئے طے کیا جاتا ہے، خواہ سیاست میں خواہ تجارت میں۔

رکنیت کے سوال کے ماسوا باقی باتوں کے سلسلے میں حق نامنظوری میرے خیال میں کسی خاص تشویش کا مستحق نہیں خصوصاً اس لئے کہ اقوام متحدہ کی جو مشنری اب ہے اس میں کافی لچک پیدا کر دی گئی ہے۔ اب روسی سلامتی کونسل میں حق نامنظوری حاصل ہونے کی بنا پر اقوام متحدہ کو عمومی اسمبلی کے ذریعہ کوئی ایسی بات کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتے جسے ممبروں کی مطلوبہ اکثریت کرنا چاہتی ہو اور مادی طور پر اس کی استعداد رکھتی ہو۔ مختصر اسمبلی کا قیام یا قرار دادِ امن کے لئے اتحاد پیدا کرنے والی کمیٹی کا قیام ایسے طریقے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ لینا کوئی ایسی بات نہیں جو سیاستدانوں اور ماہرینِ آئین کی استعداد سے باہر ہو۔ برطانیہ عظمیٰ، ریاستہائے متحدہ اور دوسرے جمہوری ملکوں کی آئینی تاریخ کے ہر طالب علم کو اس کا علم ہے کہ آئینی ضابطے اور اس کے عمل میں اس لچک اور ابداع نے صحیح قسم کے جمہوری سماج

جہاں اقوام متحدہ میں چند ملکوں کی عدم موجودگی تمام آزاد انسانوں کے لئے افسوس کا موجب ہے وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سوویٹ روس اور کامنفارم کے دُوسرے ملکوں کی موجُودگی کو اس عالمی تنظیم کے لئے کمزوری کا باعث گردانتے ہیں۔ یہ نکتہ اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔

اقوام متحدہ کے مباحثوں میں کامنفارم ممالک کے نمائندوں کی شرکت جو اقوام متحدہ کو اپنی سرحدوں سے باہر کی رائے عامّہ کو متاثر کرنے کے لئے پروپیگنڈے کے میدان کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں لازمی طور پر رعایت باہمدگر کے اصُول کے سخت منافی ہے۔ سوویٹ لیڈر ایسے طریقوں کا استعمال وسیع پیمانے پر کرتے ہیں جو اقوام متحدہ کے مباحثوں کو کیمونسٹ ملکوں کی رائے عامّہ پر کوئی اثر ڈالنے سے قاصر رکھیں مثلاً لوگوں اور خبروں کے آنے جانے پر پابندی، ریڈیو کو معطل کر دینا، سنسر لگا دینا اور رسل و رسائل کے تمام ذرائع کی مکمّل اجارہ داری۔

آہنی پردے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ یہ کیمونسٹ سلطنت کے اندر کے لوگوں اور بیرونی دُنیا کے لوگوں کے درمیان کسی بھی قسم کے رابطے میں مزاحم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل جو چیز سوویٹ آمریّت کو ہر قسم کی آزادی اور خود ندی سے نفرت کرنے پر مجبُور کرتی ہے وہ مختلف افراد اور گروپوں کے درمیان کسی قسم کا حقیقی رابطہ پیدا ہونے کا یہی خوف ہے۔ یہ خوف اس آمریّت کا لازمی وصف ہے لہٰذا کیمونسٹ حکمراں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ماتحتوں کے درمیان کوئی زندہ اتحّاد ہرگز قائم نہ ہو سکے۔ ہم بیرونیوں کو جو چیز آہنی پردہ نظر آتی ہے وہ صرف اس آہنی ردا کا اُفقی کنارہ ہے جو کریملن اور پیکن کے حکمرانوں نے دُنیا کے ایک تہائی رقبے اور تقریباً دس کھرب انسانوں پر ڈال رکھی ہے۔

یہ آہنی پردہ یا آہنی ردا اقوام متحدہ کے قلب پر چوٹ لگاتی ہے۔ یہ اس تصوّر کے سخت منافی ہے جس کا مطمح ایک انسانی پارلیمنٹ ہے خواہ یہ کتنی ہی نامکمّل اور خام کیوں نہ ہو باقی دُنیا کے ساتھ مراسم کے سلسلے میں خواہ وہ کسی بھی میدان میں ہوں کیمونسٹ لیڈروں کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ یہ صرف یک طرفہ کھیل ہے اگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے تو اپنے آپ کو دھوکا دیں گے۔ اگرچہ

[illegible] رکھتے ہیں کہ اپنے ملکوں کو یہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیں کہ دنیا واقعتاً کیسی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اپنے مفاد اس سے متضاد تصوّر کے متقاضی ہیں۔ جمہوری ملکوں کو ڈرنا اس بات سے چاہیئے کہ اُن کے شہری کوئی ایسی چیز دیکھیں جو پوری تصویر نہ ہو۔ انھیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے شہریوں کے سامنے پوری تصویر ہی آئے۔ ایک ایسی تصویر جو داغوں اور دھبّوں تک کی اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہو اُن کے صحیح تناسب کے ساتھ عکّاسی کرتی ہو۔ اس سے کم کوئی بھی چیز اس نظریئے کے سامنے سپر اندازی ہوگی جس کی ہم مخالفت کر رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اقوامِ متّحدہ کی رکنیت کا سوال ہے یہ اسمبلی خود جمہوری ملکوں کے نقطۂ نگاہ سے کم مُفید ہو جائے گی اگر اس میں کمیونسٹ نمائندے موجود نہیں ہوں گے۔ یورپ کے کمیونسٹ ملکوں ملکوں کے ڈیلی گیٹوں کی موجودگی اور سوویٹ بلاک کے ممبروں کی انتہا پسندی کے تجربے نے بیسیوں ملکوں کے ڈپلومیٹوں اور پبلک کو اس حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے میں کافی حصّہ لیا ہے کہ روسیوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے صحیح طریقے کیا ہیں اور اس سلسلے میں کیا کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ کمیونسٹوں نے اپنے آپ کو ہماری نگاہوں کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے اور اُن کی قوّت اور کمزوریاں دونوں ہمارے سامنے آ گئی ہیں۔ اس بے نقابی سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے خواہ جو تصویر ہمارے سامنے آئی ہے وہ ادھوری ہی ہو۔

کمیونسٹوں کی شرکت نے دُنیا کی غیر کمیونسٹ حکومتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں بھی بڑا حصّہ لیا ہے۔ اگر میں کمیونسٹ ممالک کی شرکت کو آزاد دُنیا کے لئے مُفید سمجھتا ہوں تو یہ اس کی بنیادی وجہ تو نہیں لیکن ایک سبب ضرور ہے۔ میں اس بیان اُن بے صبر لوگوں کی توجّہ دلاتا ہوں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر رُوسی اور اُن کے ساتھی اس سے باہر نکل جائیں تو اقوامِ متّحدہ ایک زیادہ مُفید ادارہ بن جائے گی۔

بہر حال اقوامِ متّحدہ میں سوویٹ یونین اور اس کے حاشیہ بردار ملکوں کی شرکت کو اہمیت

کہ مفاہمت اور تعاون کے عالمگیر ادارے میں وہ ملک بھی شامل رہیں جو امکانی حملہ آور ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اقوام متحدہ کے اس قسم کے نمائندہ اداروں مثلاً اسمبلیوں اور کونسلوں کی قدر و قیمت پر زور دیا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ یہ ادارے بہ ذاتِ خود گفتگوئے مصالحت کا واحد یا مؤثر ترین ذریعہ ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ حکومتوں کو مختلف مسائل کے سلسلے میں پبلک طور پر ایسی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو واقعتاً گفت و شنید کی محرک بن سکتی ہو اور اس لئے بھی کہ یہ ادارے ایک ایسی عالمی پالیسی کی آرزو اور ضرورت کو ہمارے سامنے لاتے رہتے ہیں جس کے پیش نظر نوعِ بشر کے مشترکہ مفاد ہوں۔

مختصر یہ کہ اقوام متحدہ کا بنیادی کردار میری نظروں میں یہ ہے کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے مسئلوں کو مفاد کے بنیادی اشتراک کے پس منظر میں ان کے صحیح تناسب کے ساتھ درست نقطۂ ماسکہ پر لے آئے۔ میں نے اس نقطۂ نگاہ کو اپنے ان لفظوں میں ادا کرنے کی جسارت کی تھی جو میں نے اقوام متحدہ کی عمومی اسمبلی کی ابتدائی بحث میں ۱۹۵۴ء میں کہے تھے، اس وقت میں نے کہا تھا:

"جوہری سائنس کے ٹیکنیکل عوامل اور ان کے مسلسل ارتقاء نے نوعِ بشر کے انحصارِ باہم کو اس سرعت کے ساتھ ضروری بنا دیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رائے عامہ یا حکومتوں کو ابھی پوری طرح اس کا احساس نہیں ہو سکا لیکن بد قسمتی سے جیسے جیسے ہمارے انحصار باہم میں اضافہ ہو رہا ہے ویسے ویسے ہی ہمارے اختلاف بھی پختہ ہوتے رہے ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت کہ اگر ہم ہم آہنگی اور مصالحت کا کوئی طریقہ نہ ڈھونڈ سکے تو یہ اختلاف ہمیں تباہ کر دیں گے۔ مفاہمت، مصالحت اور اتحاد کے مرکز کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ اتحاد سے میرا مطلب وہ بے جان یکرنگی ہرگز نہیں ہے جو آمریت کیشوں کا مطمحِ نظر ہے۔

"اگر ہم ان اختلافات کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں انھیں تسلیم کرنا اور سمجھنا چاہیئے۔

صرف ریاست کے غلام ہوتے ہیں اور بین الاقوامی اُمور میں حربی قوّت اور جارحانہ حملے پر انحصار اُن کی حکومتوں کا بنا بنایا طریق کار ہوتا ہے خواہ اس پر امن اور بقائے باہم کے لفظوں کے پردے ڈالی کر ابہام پیدا کرنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ دوسری طرف آزاد سماجیں اس نظریئے پر قائم ہیں، خواہ اسے عملی جامہ کتنے ہی نامکمل طریقے پر کیوں نہ پہنایا گیا ہو کہ انسانوں کے کچھ حقوق اور فرائض ایسے ہیں جو ریاستوں اور حکومتوں سے بالا ہیں۔ ان ریاستوں اور حکومتوں کو انسانوں نے اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ قانون اور انصاف کے مطابق ان کی آزادی اور شخصی سلامتی کا تحفظ کر سکیں۔

"پھر اختلاف دُنیا کے ان حصّوں کے درمیان ہے جہاں خود حکومتی مروّج ہے اور جہاں مروّج نہیں۔ بعض لوگ اس اختلاف کو اس فرق کے مترادف قرار دیتے ہیں جو ایک طرف نوآبادیوں کا انتظام کرنے والے ملکوں اور دوسری طرف ماتحت علاقوں کے درمیان موجود ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایسا غلط طور پر سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عملاً دُنیا کے اس حصّے کا رقبہ جہاں خود حکومتی مروّج نہیں ماتحت علاقوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ قوم جس پر ایک ڈکٹیٹر کی حکومت ہے، جس کی قوّت کا انحصار صرف فوج اور پولیس کے کنٹرول پر ہے ایک ایسی قوم ہرگز نہیں جو خود حکومتی کی مدعی ہو سکے۔ خواہ یہ ڈکٹیٹر اپنے بیشتر ماتحتوں کا ہم نسل ہو اور اُنھیں کی زبان بولتا ہو۔ ایک کٹھ پُتلی ریاست، ایک آمرانہ قوّت کی حاشیہ بردار ڈکٹیٹرشپ کے عوام، ان عوام کے مقابلے میں خود حکومتی کے حق سے کہیں زیادہ محروم ہیں جو مثال کے طور پر کسی ایسی نوآبادی کے عوام ہیں، جو ایک خود قائم کردہ جمہوری حکومت کے ماتحت قومی آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں خواہ بعض اوقات اس کی رفتار نہایت سُست ہو یا سُست نظر آئے۔

"پھر ایک فریق دُنیا کے ان حصوں میں ہے جہاں ایک طرف وہ ملک ہیں جو صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ ہیں اور نسبتہً ان کا مادی معیار زندگی بلند ہے اور دوسری طرف وہ ملک جنھیں کم ترقی یافتہ علاقے" کہا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی قیادت میں ہم اس فرق کو دور کرنے کے لئے

پچھ کر رہے ہیں۔ جو طریقہ ہم ڈھونڈ رہے ہیں اس میں سست روی ضرور ہو گی لیکن مجھے امید ہے ک
میں استقامت ضرور ہے۔

"اقوامِ متحدہ ایک ایسی دُنیا میں مصروفِ عمل ہے جس میں گہرے اختلاف موجود ہیں
حقیقت یہ ہے کہ یہی اختلاف اس کے وجود کو زیادہ ضروری بناتے ہیں۔ اس صورتِ حال
اسے تمام لوگوں کا نمائندہ ہونا چاہیئے یا اس نمائندگی کی کوشش کرنی چاہیئے خواہ وہ ان اخ
حدوں کے کسی بھی جانب ہوں لیکن یہ کام اُسے چارٹر کے اصولوں سے انحراف یا انھیں کو
گزند پہنچائے بغیر انجام دینا چاہیئے۔

"ہمارا راستہ واضح طور پر طے شدہ ہے۔ یہ افلاس کے مقابلے میں اقتصادی اور سماجی
ترقی کی طرف جاتا ہے یہ راستہ مکمل اور آزادانہ حکومتِ خود اختیاری کی طرف جاتا ہے۔ اس
قسم کی حکومت آمرانہ نظامِ حکومت سے بالکل متضاد ہے خواہ وہ آمرانہ نظامِ حکومت داخلی
طور پر نافذ کیا گیا ہو خواہ خارجی طور پر، یہ راستہ انسانی حقوق اور فردِ واحد کے وقار اور
اس کی اہمیت کے حصول کی طرف جاتا ہے۔"

# تہذیبوں کے باہمی تعلّقات

جمہوریت اور عالمی سیاست کے مسئلے جس نئے پیمانے پر ہمارے سامنے آتے ہیں اس کے چند مفاہیم کا مطالعہ کرتے ہوئے اس وقت تک ہم نے دو پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ ایک پہلو اس حربی قوّت میں خوفناک اضافہ ہے جو انسانوں کو، کسی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہ طور وسیلہ دستیاب ہو سکتی ہے اور دوسرا پہلو ان بین الاقوامی برادریوں کی وسعت ہے جن کی طرف سے پالیسیوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی تنظیموں بالخصوص اقوام متحدہ کی نوعیت اور کردار کا جائزہ لیا گیا ہے کہ موجودہ ماحول میں ڈپلومیسی کا طریقِ کار کیا ہے اور گفت گوئے مصالحت کا انداز کیا؟

لیکن خارجہ پالیسی کے مسائل، جسامت اور اہمیت کے اعتبار سے جس نئی شکل میں ہماری نسل کے سامنے آتے ہیں اس کا ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ اس پہلو کا تعلق مختلف تہذیبوں کے باہمی تعلّقات سے ہے۔

کئی صدیوں سے ڈپلومیسی کے بڑے بڑے مسائل مغرب میں ان تبدیلیوں کے آئینہ دار رہے ہیں جو یورپ کی مختلف ریاستوں کے باہمی مراسم میں رُونما ہوئیں۔ آج بیشتر دُور رَس مسائل ان ملکوں کے درمیان پیدا نہیں ہوتے جو ایک ہی تہذیب سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ مسائل خود تہذیبوں کے اختلاف کا نتیجہ ہیں۔

آج اگر ایشیا پر نظر ڈالی جائے تو جو حقیقت باقی تمام حقیقتوں سے نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی قدیم معاشرے اور تہذیبوں کی نشاۃ الثانیہ ہے۔ تمام ایشیا میں ایک نئی بیداری

موجزن ہے اور زندگی میں ایک نئی حرکت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک صدی پہلے مشرق جمود اور بے حرکتی کی علامت تھا۔ اس نے کامیابیوں کے عظیم دَور دیکھے تھے لیکن اب وہ صرف اپنے گمشدہ درخشاں ماضی سے مریضانہ دل بستگی کے اظہار اور خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف تھا آج مشرقی قومیں سرگرم اور مضطرب ہیں۔ ان کے سامنے نئے تصوّر ہیں اور وہ آزادی اور فلاح کی نئی منزلوں تک پہنچنے کا پختہ عزم کیئے ہوئے ہیں۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تمام خیر خواہ لوگوں کو خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اسلامی دنیا، ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کی یہ تمنّا اور کوشش کہ ایک نئی اور بھرپور زندگی کی طرف قدم بڑھایا جائے اور کسی نہ کسی طرح سے جدید ٹیکنیکل ترقیات اور اپنی تہذیبوں اور روایات کی روح کے درمیان ربط پیدا کیا جائے ایک دل افروز تمنّا ہے اور تمام دنیا کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

اس بیداری کی شدت اور گہرائی کا نہ تو غلط اندازہ لگانا چاہیئے اور نہ اسے غلط رنگ میں پیش کرنا چاہیئے۔ یہ تصور کرنا حماقت ہوگی کہ مشرق میں جنم لینے والے یہ نئے سیاسی سماج ان سماجوں کا ہو بہو خاکہ ہوں گے جن کا ہم مغربیوں کو تجربہ ہے۔ ان قدیم تہذیبوں کی تجدید نئی شکلیں اختیار کریگی یہ نئی شکلیں ان لوگوں کے لیئے دلچسپی کا باعث ہوں گی جن میں وہ انکسار اور آگاہی موجود ہے جو کسی نئی چیز کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

ماضی میں تمام بڑی تہذیبوں میں اپنے ترقّی کے ادوار میں پھیلنے کا رجحان تھا۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اسے "سامراجی" کہہ لیجیئے۔ یہ رجحان مشرق میں بھی موجود رہا ہے اور مغرب میں بھی۔ اس وقت تک اس قسم کی پھیلنے والی تہذیبوں کا مسلّمہ باہمی تعلّق یا تو تصادم اور جنگ رہا ہے اور یا ایک غیر تسلی بخش متارکہ۔ اب ہم ایک نئے دَور میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مختلف تہذیبوں کو ساتھ ساتھ رہنے کا ڈھنگ سیکھنا پڑے گا اس کے لئے پُرامن مبادلہ ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرے سے سیکھنا، ایک دوسرے کی تاریخ، اس کے آدرش، اس کے آرٹ اور اس کی ثقافت کا مطالعہ کرنا ضروری

دنیا میں غلط بھی اُسی کی انتہا ... اور تباہی کی طرف ہی جاتا ہے۔

ایشیائی تہذیبوں کی تجدید کے اس نقشے کو اب کلّیت کا خطرہ بگاڑ رہا ہے۔ ماضی میں ہر ترقی پسند تحریک کو کسی نہ کسی حد تک بربریّت کا خطرہ درپیش آیا ہے جو یا تو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی اور یا اس میں مضمر تھی۔ آج ہم پہلی بار یہ دیکھ رہے ہیں کہ تمام انسانی تہذیبوں کو مشترکہ طور پر بربریّت کی ایک نئی شکل کا خطرہ درپیش ہے اور کچھ تہذیبیں تو وقتی طور پر اس میں ڈوب بھی گئی ہیں۔ یہ خطرہ بھاری بھی ہے، منظّم بھی اور بے رحم بھی۔

ایک ایسے دور میں جیسے اطالوی فاشسٹوں، جرمن نازیوں اور روسی اور چینی کمیونسٹوں کا تجربہ ہے، یہ سمجھنے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں کہ کلّیت کی اس ترقّی سے جو خطرہ پیدا ہوا ہے اس کی شدّت اور نوعیت کیا ہے۔ اقدار کا شدید انکار اور قوّت کو مقصود بالذّات سمجھ کر اس کا حصول چند خاص قسم کے انسانوں کے لئے جو باقی اعتبار سے کافی ذہین ہوتے ہیں خوفناک حد تک کشش رکھتا ہے۔ تمام اشیا اور تمام انسانوں کو قوّت کے واحد مقصد کا ذریعہ سمجھتے ہوئے ان پر قبضہ پانے کی ماورائے خیر کوشش ایک طرح کا وحدت پیدا کرنے والا عنصر تک ثابت ہو سکتی ہے اور وقتی طور پر ایک زبردست سماجی قوّت متحرّکہ کو عمل میں لا سکتی ہے۔

مزید برآں یہ منفی قوّتِ متحرّکہ مناسب نظریاتی وردی میں ملبوس ہو کر کم ترقّی یافتہ ملکوں میں قومیت یا سماجی ترقّی کی صحیح عوامی تحریکوں پر قبضہ پانے میں بھی کامیاب ہوئی ہے اور اس نے ہزاروں مخلص اور عقیدتمند مردوں اور عورتوں کے جوش کی عناں گیری کی ہے۔ چند ہی سال کے اندر یورپ اور ایشیا کے مٹھی بھر کمیونسٹ واقعات کی تنظیم اس طرح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اس کی بدولت سیاسی اور سماجی گروہ بندی کا ایک ڈھانچہ تیار ہو گیا ہے اور کروڑوں عوام پر ان کی مؤثّر حکومت قائم ہو گئی ہے۔

یہ کامیابی حیرت انگیز بھی ہے اور دہشت انگیز بھی، اور عالمگیر جدوجہد کی شکل میں اس کے نتائج نے ہمارے بیشتر سیاسی فکر میں رنگ آمیزی کی ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ہمارے بیشتر

خدشات کا محور اور ہماری بیشتر ڈپلومیٹک سرگرمیوں کی محرک یہی کامیابی رہی ہے۔

لیکن اپنے مرکزی بین الاقوامی مسئلے کو بنیادی طور پر صرف کیمونزم سے نبٹنے کا مسئلہ سمجھنے کا رجحان اور دنیا کو سرد جنگ کے قطبین کی شکل میں دیکھنے کا رجحان میرے نزدیک صورت حال کو خوفناک حد تک سہل سمجھنے کے مترادف ہے۔ ہمارے بنیادی مسائل اب تک قوموں سے ہی متعلق ہیں۔ ہمارا تعلق ان کی تہذیبوں یا تہذیبوں کے فقدان سے ہے جن سے ہمیں خطرہ درپیش ہے۔ ان کے ساتھ نبٹنے کے لئے بھی مؤثر پالیسی کا انحصار جزوًا اس بات پر ہوگا کہ روسی اور چینی سماجوں کی ان حقیقتوں کا پتہ لگایا جائے اور ان پر غور کیا جائے جو مارکسزم کی بالائی عمارت کے نیچے موجود ہیں۔ مزید برآں میرے خیال میں یہ بات زیادہ حقائق پسندانہ اور زیادہ بارآور ہوگی کہ ہم ایشیا میں امن کو پیش آنے والے خطروں کا تدارک کرنے کے سلسلے میں کیمونزم کی بجائے چینی سامراج کا ذکر زیادہ کریں۔ چینی سامراج کے خطروں کو ایشیائی اپنے تجربے کی بنا پر سمجھ سکتے ہیں لیکن کیمونزم ان کے لئے کچھ زیادہ دہشت نہیں رکھتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آزاد ایشیائیوں کی اکثریت کے لئے کیمونزم کے مفہوم کی اہمیت اور بھی کم ہے۔

ماسکو اور پیکین کے سلسلے میں اپنی مشکلات کو سمجھنے کے لئے میرے نزدیک روسی زاروں اور چینی شہنشاہوں کے زمانوں اور ان کی زندگیوں کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا جدلیاتی مادیت کا ماہرانہ علم۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نظریاتی پہلو کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ میں اس کی بنیادی اہمیت کا قائل ہوں لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا اس سطح پر ہماری کامیابی کا انحصار کیمونزم کا مقابلہ کرنے سے کم ہے اور اپنے عقیدے کی عالمگیر قدروں کو دریافت کرنے پر زیادہ۔ جس حد تک ہم ان اقدار کو اپنی پالیسیوں اور اپنے عمل میں سمو سکیں گے اسی حد تک ہماری اخلاقی اور استدلالی قوت میں اضافہ ہوگا اور یہ قوت متعدی ثابت ہوگی۔ اگر ہم ان اقدار کو پالیسی اور

سمجھا جائے گا جو واقعتاً وہ ہیں بھی اور ہمیشہ سے رہی ہیں۔

مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ جن متعدد مسائل کا ہمیں سامنا ہے اُنھیں آمریت نمایاں اور برانگیختہ تو ضرور کرتی ہے لیکن یہ مسائل اس نے پیدا نہیں کیے۔ اس کے متعلق ہماری جائز تشویش اور خدشات کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم بلاوجہ ان مسائل سے ہی اپنی توجہ ہٹا لیں۔

تاریخ میں اس قسم کے طوفان پہلے بھی آتے ہیں اگرچہ کسی طوفان نے ــ حتیٰ کہ انقلابِ فرانس نے بھی ــ بیسویں صدی کے آمرانہ خطروں کی طرح ہمہ گیر اور عالمگیر نتائج پیدا نہیں کیے اور نہ کوئی طوفان اتنے تشویشناک، بسا اوقات سرسام کی حد تک تشویشناک، ردِّعمل کا باعث بنا ہے۔

روس اور چین کے کمیونسٹ سامراجوں کے مشترکہ خطرے کے پیشِ نظر ایک بدیہی اور ضروری جوابی کارروائی یہ ہونی چاہیئے کہ نہ صرف مغرب کی جمہوری قومی ریاستیں ہی آپس میں متحد ہو جائیں بلکہ ان تمام تہذیبوں کے درمیان تعاون کو فروغ دیا جائے جنھیں کمیونسٹ سامراجوں کا خطرہ لاحق ہے۔

اس قسم کے تعاون میں جو مشکلات حائل ہیں ان کی نوعیت مخصوص بھی ہے اور گہری بھی، کیونکہ یہ تعاون ان قوموں کے درمیان ہوگا جن کی طرزِ معاشرت بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یورپی ریاستوں کے درمیان گذشتہ تین سو سال میں جو رقابتیں اور باہمی خدشے حائل رہے ہیں وُہ لازمی طور پر شدید تھے اور ان کے درمیان مفاد کا جو اختلاف تھا وُہ بھی اختلافِ نظر اور اس سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وجہ سے کافی پیچیدہ تھا۔ یہ صُورتِ حال کسی نہ کسی حد تک اب بھی قائم ہے۔ ان رقابتوں کی جگہ اعتماد اور تعاون کو بروئے کار لانا آسان نہیں لیکن ان وسیع متصادم قومی روایات کے باوجود تعلیم، خیال اور اقدار کے معاملے میں ان قوموں کے درمیان ایک بنیادی مماثلت رہی ہے۔ اس مماثلت نے مفاہمت کو آسان بنایا ہے، دشمنی کی شدّت کو کم کیا ہے اور سمجھوتے اور معاہدے کو نسبتاً کم مُشکل بنا دیا ہے۔

مختلف تہذیبوں والی قوموں کے درمیان مفاہمت اور سمجھوتے کے راستے کی مشکلات کو

دُور کرنے کا کام بنیادی طور پہ دشوار ہوتا ہے اور پھر مادّی معیارِ زندگی کا وسیع فرق اور فتح، نوآبادیات اور نسلی تکبّر کی گذشتہ یادوں سے پیدا ہونے والی نفرت اس دشواری میں مزید اضافہ کردیتی ہے لہٰذا اگر اختلافِ مفاد کو دُور کرنے کے مسئلے میں جو بہر اعتبار ایک مشکل کام ہے گہری اور بنیادی اخلاقی غلط فہمیوں کا اضافہ کرکے اُسے پیچیدہ تر بنانا مقصود نہیں تو ہر طرف سے اس بات کی سرگرم کوشش ہونی چاہیئے، کہ معاملہ بینی، رواداری اور ضبط کو بروئے کار لایا جائے۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان غلط فہمی کے خطرے کا سب سے بڑا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ مقاصد کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے۔ اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دُوسرے ہمارے مقاصد کو صحیح طور پہ سمجھ جائیں تو اس کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ ہم خود واضح طور پہ یہ طے کرلیں، کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں۔



مثال کے طور پہ اقتصادی مدد کے معاملے پر غور کیجیئے۔ امریکہ میرے ملک اور مغربی دُنیا کے دیگر اہم مراکز کی معیّت میں بے مثل فراخ دلی کے ساتھ اپنے ذرائع میں سے نسبتاً کم خوش قسمت ملکوں کی اقتصادی اور تکنیکی ترقّی کے لئے روپیہ صَرف کر رہا ہے۔ یہ صرفہ یا تو براہِ راست کیا جاتا ہے اور یا بین الاقوامی تنظیموں مثلاً کولمبو پلان، اقوامِ متّحدہ اور بین الاقوامی بینک کے ذریعہ۔

اگر ہم یہ صرفہ برداشت کرتے ہیں تو اس کی تین جائز وجہیں ہیں۔ ایک وجہ انسان دوستی ہے۔ مادّی طور پہ زیادہ خوش حال قوموں کی صدقدلانہ خواہش کہ جو قومیں نسبتاً کم خوشحال ہیں اُن کی مدد کی جائے۔ دُوسری وجہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ایک ایسی دُنیا میں جہاں خوش حالی عالمگیر ہو زندگی بسر کرنا خود ہمارے مفاد میں ہے۔ دُوسری قوموں کا معیارِ زندگی جتنی جلدی اُونچا ہو جائے اُتنا ہی ہم سب کے لئے اچھا ہے اور یہ کہ ایک ایسا رہائشی علاقہ جس کے چاروں طرف تنگ و تاریک مکان ہوں صرف بے اطمینانی کا باعث ہی نہیں بلکہ بالآخر ناقابلِ برداشت بھی ہے۔ تیسری وجہ یہ امید ہے کہ

اس پر حملے کا امکان کم ہو جائے گا اور اسی اعتبار سے جنگ کے امکانات میں بھی کمی واقع ہوگی۔

لیکن اس غلط تصور سے بچنا بہت ضروری ہے کہ ہم ملکوں کو خرید کر اپنا اتحادی بنا سکتے ہیں یا یہ کہ ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ کمیونسٹ پروپیگنڈہ ایشیا بھر میں ہم پر اس اندازِ نظر کا اتہام لگا رہا ہے یہ ضروری ہے کہ اس پروپیگنڈے کو غلط ثابت کیا جائے۔ مشرقی ممالک ہماری صفوں میں تنخواہیوں کی طرح شامل نہیں ہوئے۔ اگر ایشیائی یہ سمجھنے لگیں کہ مغربیوں نے اس قسم کے خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ دے کر اُن کے وقار کی توہین کی ہے یا ان کی ایمان داری کا غلط اندازہ لگایا ہے تو یہ افسوسناک ہوگا۔

ہمیں اس سطحی تصوّر سے بچنا چاہیئے کہ کمیونزم صرف بھوکوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے اور یہ کہ اُونچا معیارِ زندگی اس رغبت کا خاتمہ کر دے گا۔ انسانی فطرت اتنی سہل ہرگز نہیں ہوتی۔

اس نکتے پر بڑی توجہ سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے متعلق غلط فہمی بہت عام ہے۔ آمریت کیشوں کے رائے عامہ کے متعلق دو ہی رویّے ہیں۔ اس پر غلبہ پانا یا اس سے خوف زدہ ہونا۔ یہ بات حیرت کا موجب نہیں کہ انھوں نے پروپیگنڈے کے وسائل اور طریقوں کو ترقی دینے کے لئے بے اندازہ قوتوں اور ذرائع کو وقف کر رکھا ہے۔ ان کے بنیادی طریقوں کا مغربی دُنیا کو اب اچھی طرح علم ہے۔ یہ طریقے ہیں ایک بہت بڑا جھوٹ بول دینا، اُسے متواتر اور ان تھک طور پر دُہرائے جانا، اور اس چیز سے بالخصوص فائدہ اُٹھانا جسے ماہرینِ نفسیات خیالات کا تلازم غیر استدلالی کہتے ہیں۔ یہ آخری طریقہ بہرحال ایک ایسا طریقہ ہے جسے مغرب کے تجارتی اشتہاروں میں کافی حد تک آزمایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں اس کا استعمال بے ضرر بھی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً مشروباتِ لطیف، سگریٹ یا موٹر کے اشتہار میں ایک ایسی خوبصورت لڑکی کی تصویر دے دی جاتی ہے جو غسل کے لباس میں ہو۔ اب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اگر تم اُن میں سے کوئی چیز خریدو گے تو تمھیں یہ لڑکی بھی مل جائے گی۔ لیکن اشتہار اس خوش آئند امکان کی تردید ہرگز نہیں کرتا اور اس سے فروخت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی طرح کمیونسٹ پروپیگنڈہ کرنے والے عوام کے دل میں روسی پالیسیوں کی حمایت یا روسیوں کے احکام ماننے والوں کی حمایت کا خیال ایک بالکل مختلف خیال کے ساتھ ملا کر پیش کرتے ہیں مثلاً زیادہ تنخواہوں یا کم لاگت کے مکانوں کا تصوّر یا کسی حقیقی یا فرضی سماجی بے انصافی کے خلاف احتجاج۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس بات کے خلاف وہ احتجاج کرتے ہیں وہ واقعی افسوسناک ہوتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس چیز کی وہ حمایت کر رہے ہوں وہ بذاتِ خود مستحسن ہو لیکن ان مقاصد کا کمیونزم یا سوویٹ روس اور کمیونسٹ چین کی پالیسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور بسا اوقات تو ان کے مابین نسبتِ معکوس ہوتی ہے لیکن عام آدمیوں کے اس رجحان کا ناجائز استعمال کہ وہ جن باتوں کو اکٹھا دیکھتے ہیں یا ان کے متعلق ایک ساتھ سنتے ہیں انھیں آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں خواہ ان میں کوئی منطقی تعلق ہو یا نہ ہو بسا اوقات کامیاب رہتا ہے۔

مثال کے طور پر تلازم غیر استدلالی کا یہ طریقہ کئی سال تک مغربی دنیا کے لوگوں کی ایک کافی تعداد کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ کمیونزم ایک ترقی پسند تحریک ہے حالانکہ واقعتاً یہ تحریک اتنی ہی رجعت پسندانہ ہے جتنے جبر اور گناہ۔ حال ہی میں پروپیگنڈے کا یہ طریقہ متعدد قومی تحریکوں پر غلبہ پانے اور کروڑوں ایشیائیوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہا ہے کہ کمیونزم سامراج کا مخالف ہے حالانکہ اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ کمیونزم اس صدی کا سب سے زہریلا سامراج ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اس آسان تجویز کو ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھا ہے کہ جہاں معیارِ زندگی اونچا ہوگا یا مادّی حالات بہتر ہوں گے وہاں کمیونزم سے کوئی خطرہ نہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں صورتِ حال اتنی سہل اور آسان ہرگز نہیں۔

مثال کے طور پر فرانس اور اٹلی میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جن اضلاع میں اوسط آمدنیاں سب سے زیادہ ہیں وہیں سے کمیونسٹوں کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں۔ کیا کوئی شخص سنجیدگی

پر ہوگا کہ ان کی امیدوں کا اس سطح تک پورا حصول ہو جائے جو ممالک کے طور پر آج کے
شمالی حصوں میں موجود ہے۔ ذہنی اور روحانی تصورات آدمی کے معیارِ زندگی کے ساتھ ساتھ
اس طرح ہرگز نہیں بدلتے۔

میں یہ تجویز ہرگز پیش نہیں کر رہا ہوں کہ مغرب ایشیا کو اقتصادی امداد نہ دے اور نہ
میں اس امداد کی اہمیت کو گھٹا رہا ہوں۔ اس کے برعکس میں ان امدادی پروگراموں میں ایک ایسی
ترقی کا امکان دیکھتا ہوں جو عالمی سیاست کے سارے ماحول کے لئے امید افزا ہے۔

میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر مغربی ممالک مادّی مدد صرف یا بنیادی طور پر سرد جنگ
کے مقاصد کے لئے دے رہے ہیں تو یہ مدد کوئی بھی اچھا یا مستقل نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہے گی لیکن
اگر ہم یہ مدد ایشیائیوں اور اپنے دوسرے پڑوسیوں کے ساتھ رشتۂ اخوت کے احساس کی بنا پر
دے رہے ہیں تو ہم سیاسی ماحول کو بہتر بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے اور انسانی فلاح
کے فروغ میں بھی، خیر خواہی متعدی ہوتی ہے۔

جہاں اقتصادی مدد اہم ہے وہاں یہ بات بھی اہم ہے اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے
کی ضرورت ہے کہ کمیونسٹ پروپیگنڈے کا بنیادی جز دیہ ہے اور اسے ہزاروں ایشیائیوں نے باور
کر لیا ہے کہ مغرب کے پاس دینے کے لئے صنعتی علوم کے ماسوا اور کچھ نہیں۔ ان کے پاس کوئی فلسفہ
نہیں صرف آوارہ خیالی ہے۔ مغرب کنفیوشس کے مقابلے میں صرف کوکا کولا پیش کرتا ہے۔

اس پروپیگنڈے میں ہمارے امداد و تعاون کے پروگراموں کو ہی ہمارے خلاف ثبوت کے طور
پر استعمال کر لیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی سوویٹ یونین اگرچہ چین کی عوامی جمہوریت کی اقتصادی
مدد بھی کر رہا ہے اور فوجی بھی اور یہ مدد بلا معاوضہ ہرگز نہیں۔ آزاد ایشیائی ملکوں کے اندر کمیونزم کے
پیرو خیالات کی تبلیغ پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ سوویٹ
روس میں تنظیم کے طریقے بہتر ہیں اور وہاں ادب کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا
کی بیشتر یونیورسٹیوں اور تہذیبی مراکز میں خدمتِ انسانی اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے متعلق

ایشیائی اور یورپی زبانوں میں جو ارزاں کتابیں موجود ہیں اور جنھیں ایشیائی طالب علم بہ آسانی خرید سکتے ہیں ان کی بہت بڑی تعداد کمیونسٹ اشاعت گھروں کی مطبوعات کی ہوتی ہے۔

تہذیبوں کے مراسم کے سلسلے میں اُلٹی بات یہ ہے کہ اس حقیقت سے کہ آدمی صرف روٹی پہ زندہ نہیں رہتا اور نہ اپنی حفاظت صرف ہتھیاروں سے ہی کرتا ہے۔ مغربی جمہوریتیں فائدہ نہیں اُٹھا رہیں بلکہ کمیونسٹ جو علانیہ مادّیت کیش ہیں اپنے رجعت پسندانہ اور غلام بنانے والے عزائم کو چھپا کر اس سے ناجائز فائدہ اُٹھا جاتے ہیں۔

ایشیائی اور مغربی ممالک کے تعلّقات کے سلسلے میں ٹیکنیکل علوم کی اوّلیت پر ہمارا زور ایک بڑی تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔ یہ صُورت ایک نسل پہلے کی صورتِ حال سے بہت مختلف ہے یہاں مغربی مشنریوں کا وہ کردار سامنے آجاتا ہے جو انھوں نے گذشتہ سَو سال میں اَدا کیا۔ انھوں نے انسانی نسلوں کے درمیان [illegible] کو فروغ دیا، سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کرنے میں حصّہ لیا اور اسکول اور ہسپتال قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ غیر دُنیاوی میدان میں بھی ابھی پچھلے دنوں تک زیادہ زور صرف یا بنیادی طور پر ٹیکنیکل علوم پر نہیں دیا جاتا تھا۔ اس صدی کے نصف ابتدائیہّ میں ہندوستان کے ہزاروں نوجوان قانون، تاریخ اور فلسفہ سیکھنے کے لئے برطانوی یونیورسٹیوں میں جاتے تھے۔ ہندوستان کے نیم برّ اعظم کی حالیہ تاریخ کا اہم حصّہ اُنھیں فارغ التحصیل نوجوانوں کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔

آج بھی ایشیا اور افریقہ کے ہزاروں طالب علم امریکہ، کنیڈا، برطانیہ اور یورپ کے دُوسرے ملکوں میں تعلیم حاصِل کر رہے ہیں۔ یہ تعلیم وہ ان وظائف پر حاصل کرتے ہیں جو اُنھیں امدادی پروگرام کے نکتۂ چہارم، کولمبو پلان یا اقوامِ متحدہ کے پروگراموں کے تحت ملتی ہے لیکن یہ بات اہم ہے کہ یہ وظائف زیادہ تر وہ طالب علم لیتے ہیں جو انجنیئرنگ، سائنس یا دوسرے ٹیکنیکل علوم کا مطالعہ کرتے ہیں جہاں تک بذاتِ خود اس ٹریننگ کا تعلق ہے یہ اہم بھی ہے اور مستحسن بھی۔

فیصلے کی واقعی عکاسی کرتا ہے کہ قومی ترقیات اور بین الاقوامی مراسم میں تعلیم کی مختلف شاخوں کی نسبتی اہمیت کیا ہونی چاہیئے۔ ذاتی طور پر میں یہ پسند کروں گا کہ ایشیا میں سفارت کے فرائض بہترین عالم انجام دیں اور انجینیرنگ کے اعلیٰ ماہر بھی۔

مثال کے طور پر اگر تاریخ، سیاست اور فلسفے کے طالب علموں اور یونیورسٹی لیکچررو ں کے تبادلے اور ایڈیٹروں اور اخبار نویسوں کے دوروں کا انتظام کر دیا جائے تو اس سے کتنے اچھے نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مغرب کی بہترین مشینیں بھیجنے کے ساتھ ساتھ اگر ایشیا میں طالب علموں کے لئے ان ممتاز مفکروں کے کارناموں کی ارزاں اور بہ آسانی بہم رسانی کا انتظام کر دیا جائے، جن کی ژرف نگاہی نے مغربی تمدن کی تشکیل کی ہے تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ایشیائیوں کی مدد سے ہمارے اپنے علمی مراکز میں ان قدیم تہذیبوں کے مطالعے کی سہولتوں میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر تہذیبی آمد و رفت اور خدمتِ انسانی کے معاملے میں ایشیا اور مغرب کے روابط میں اضافہ کیا جائے تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگی۔ بالآخر یہ فلسفی اساتذہ اور مصنف ہوتے ہیں جو کسی قوم میں رائے عامہ پر دور رس اثر ڈالتے ہیں اور اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ مغرب اور ایشیا کی نو بیدار تہذیب کے درمیان اس قسم کے روابط کا فائدہ یک طرفہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر ہم انھیں کچھ دیں گے تو اُن سے کچھ لیں گے بھی۔

اِس سلسلے میں مَیں اپنے دوست چارلس لبنانی سفیر متعینہ امریکہ کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا تھا جو انھوں نے کلیساؤں کی عالمی کونسل میں ۱۹۵۴ء کے موسم گرما میں کی تھی۔ کونسل کا یہ اجلاس ایونسٹن میں ہوا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا:

• ایشیا اور افریقہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل اپنی تمام پیچیدگیوں کے باوجود اتنے مشکل ہرگز نہیں ہیں جتنے وہاں کے ذہنی اور روحانی مسائل ہیں۔ یہ بات ہم کسی قدر یقین

زود قائم ضرور ہو جائے گی۔ اگر یہاں کی قومیں اپنے اقتصادی ذرائع سے پوری طرح منفعت اندوز نہیں ہو رہی ہیں تو اس سلسلہ میں انھوں نے ابتداء ضرور کر دی ہے اور اگر سماجی اونچ نیچ اور بے انصافی کا وہاں اس وقت تک دَور دَورہ ہے تو اتنا ضرور ہے کہ اس دَور کے مزاج کا واضح رجحان ان کی مذمت کرنا ہے۔ ان امور میں ہم آگے کی طرف نظریں ضرور اٹھا سکتے ہیں خواہ مستقبل کے نقوش ہماری نظروں میں کم و بیش دھندلے ہی کیوں نہ ہوں۔

"لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں ذہنوں اور روحوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر ایک بار قوموں نے اپنی سیاسی آزادی حاصل کر لی، اگر ایک بار ان کی اقتصادی فارغ البالی تک رسائی ہو گئی اور اگر ایک بار انھوں نے سماجی انصاف قائم کر لیا تو ذہنوں اور روحوں کا مسئلہ از خود حل ہو جائے گا۔ موجودہ دَور کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ آدمی کا ذہن، اس کی روح اور اس کی فطرت کا بنیادی رجحان اس کے اقتصادی اور سماجی وجود کے مرہونِ منت اور تابع ہیں اور یہی ان کا منبع ہے۔"

سماجی نظاموں اور تہذیبوں کی مفاہمت کے مسئلے پر بحث ختم کرنے سے پہلے میں یہ ذکر کرنا بہتر سمجھوں گا کہ اس معاملے میں اقوام کی دولتِ مشترکہ جس کی ممبری کا شرف کنیڈا کو بھی حاصل ہے ایک اہم فریضہ انجام دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذکر سرسری ہی ہوگا۔ دولتِ مشترکہ کا نظام ڈھیلا ڈھالا ضرور ہے لیکن یہ گہرے مراسم کا آئینہ دار ہے اور اس کی ممبری میں ہر براعظم کے ملک شریک ہیں۔ ایک ایسے دَور میں جہاں شک اور کشیدگی بہت زیادہ ہے اور اس خلیج کو پاٹنے والے پُل بہت کم ہیں وہاں دولتِ مشترکہ مغرب، ایشیا اور افریقہ کے درمیان رابطے کے ایک ایسے پُل کا کام دے سکتی ہے جو افہام و تفہیم کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ضمناً اس سوال پر غور کرنا بھی مفید ہوگا کہ بین الاقوامی مراسم میں دولتِ مشترکہ کی تنظیم کی افادیت اور قوت کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ مشترک بنیادوں پر قائم ہے

کی استعداد ہر گز نہ ہوتی جس کی بنا پر ایشیا اور یورپ دونوں براعظموں کے ملکوں کے لئے رضاکارانہ طور پر اس کا ممبر بننا ممکن ہو گیا ہے۔ دولتِ مشترکہ کی قوت خاصتاً اسی بات میں مضمر ہے کہ اس کے ممبروں کو اس قسم کے رابطۂ باہمی کی قدر و قیمت کا احساس ہے۔ یہ رابطہ جتنا مبہم ہے اتنا ہی بے مثل ہے۔ اس کے ممبروں کو یہ احساس ہے کہ ایک ایسے نظام کو جس میں سبھی شامل ہوں قائم رکھنا مشترکہ مفاد کے لئے مفید ہے۔ اس قسم کا اعتراف ایک وسیع ترین الاقوامی نظام کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔

---

# جمہوریت اور قوّتِ فیصلہ

بین الاقوامی سیاست کے مسائل جس نئے پیمانے پر ہمارے سامنے آتے ہیں اس پر غور کرتے ہوئے اس وقت تک ہم نے زیادہ تر اپنے سے باہر ہی دیکھا ہے۔ ہم نے حربی قوّت پر خارجہ پالیسی کے وسیلے کی حیثیت سے غور کیا ہے۔ ہم نے ان سماجوں اور تنظیموں پر غور کیا ہے جو ملکی حدود سے وسیع تر ہیں۔ اور آخر میں ہم نے مختلف تہذیبوں کے باہمی تعلقات پر غور کیا ہے۔



ہمارے بین الاقوامی مسائل کی وسعتوں اور حدود میں اس اضافے نے ہماری جمہوری ریاستوں کے اندر بھی اُن لوگوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے جو خارجہ پالیسی کے اہم فیصلوں کی تشکیل میں حصّہ لیتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس اضافے نے بین الاقوامی مسائل کو مایوس کُن حد تک پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت بالواسطہ طور پر ہی ان فیصلوں کی تشکیل میں حصّہ لیتی ہے یعنی اپنے ووٹ کے ذریعہ۔ بہر حال ان لوگوں کا اثر فیصلہ کُن ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو ایسے اداروں کے ذریعہ جو رائے عامّہ پر اثر انداز ہوتے ہیں فیصلوں کی تشکیل میں براہِ راست حصّہ لیتے ہیں۔ اس قسم کے ادارے مثلاً پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن غلط فہمیوں اور تعصّبات کو دُور بھی کر سکتے ہیں اور ان میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ جمہوری حکومت کے چند نظاموں میں مجالسِ آئین ساز کے انفرادی ممبر یا اُن کی کمیٹیاں بھی خارجہ پالیسی کے فیصلوں اور ان پر عمل درآمد کے معاملے

کی ذمّہ داری ہی میں شامل تھا۔

میں ڈپلومیسی اور گفت و شنید کے طریقِ کار کے سلسلے میں اس نئی صورتِ حال کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اب میں پالیسی کی تشکیل کے سلسلے میں اس کے متعلق چند کلمات کہوں گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خارجہ پالیسی کے فیصلوں کے سلسلے میں عوام کی کسی نہ کسی شکل میں شرکت خود جمہوری عمل کے مزاج میں مضمر ہے۔ یہی ہونا بھی چاہیئے۔ آج کل آزاد اور جمہوری ملکوں میں خارجہ پالیسی کا مقصد صرف یہی نہیں ہونا چاہیئے، کہ وہ تمام شہریوں کے مفاد کا تحفّظ کرے اور انھیں آگے لے جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے بنیادی اصولوں اور اہم فیصلوں کو اُن کی تائید اور رضامندی حاصل ہو۔ کچھ ہی دیر پہلے مغربی ساجوں تک میں خارجہ پالیسی کے فیصلے یا تو ایک حکمراں کیا کرتا تھا یا حکمراں طبقے کے چند افراد۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات ان پالیسیوں کا مقصد بھی ان ہی چند افراد کے مفاد کی خدمت کرنا ہوتا تھا۔ آج صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ اب ان پالیسیوں سے ہم سب کا مفاد وابستہ ہے۔ آج ہم سبھی آقا ہیں سبھی خادم ہیں۔ آج ماہرین کا کوئی الگ طبقہ نہیں، ہم سب ماہر ہیں۔

آج جو لوگ خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کے سلسلے میں مجلسِ آئین یا عوام کی مداخلت کے انتشار پیدا کرنے والے ذہنی اور جذباتی نتائج سے خوف زدہ ہیں، جو اُن مبیّنہ تعصّبات اور غیر دانشمندانہ مقاصد کی شکایت کرتے ہیں جو اس قسم کی مداخلت کے محرّک ہوتے ہیں، انھیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے، کہ ایک بادشاہ یا ایک چھوٹے سے گروہ کی انتہائی مرکز حکومت میں بھی خود غرضانہ اور بے اصولانہ رسوخ استعمال ہو سکتے تھے اور ماضی میں کئی بار ایسا ہوا بھی ہے۔ محل کے منظورِ نظر درباری اور مجھے شبہہ ہے کہ کئی بار مسخرے تک اچھے اور دانشمندانہ فیصلوں میں رکاوٹ ڈال دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی خارجہ پالیسی میں جسے بڑے احتیاط سے طے کیا گیا ہو، اسی طرح تبدیلی یا انتشار کا باعث بن جایا کرتے تھے جس طرح آج کل عوامی

ایک حکمراں کا دانشمند اور دور اندیش وزیر خارجہ گذشتہ زمانے میں مؤثر جوابی کارروائی زیادہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ موجودہ دور کا وزیر خارجہ کسی اخبار کے کالم نویس، ریڈیو کے مبصر یا مجلسِ آئین ساز کی سب کمیٹی کے خلاف اس آسانی کے ساتھ مؤثر جوابی کارروائی ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے، کہ دورِ ماضی کے وزیر خارجہ کو ذاتی خطروں کا سامنا نسبتاً زیادہ ہوتا تھا۔

خارجہ پالیسی پر عمل درآمد اور اس کے کنٹرول میں مداخلتیں ایک جمہوری نظامِ حکومت میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں اور اُن کی نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ شخصی حکومت میں مداخلت لامحالہ گہری اور ناپاک سازش کی شکل اختیار کرتی ہے جیسا کہ ہم ماسکو میں دیکھ رہے ہیں۔ اگر مجلسِ آئین ساز کی کوئی کمیٹی یہ محسوس کرے کہ وزیرِ خارجہ اس پالیسی سے جو اس کے نزدیک دانشمندانہ اور وطن پرستانہ ہے انحراف کر رہا ہے تو اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس وزیرِ خارجہ کے وقار میں کسی قدر فرق آجائے یا وہ اقتدار سے محروم ہو جائے۔ لیکن اگر امورِ خارجہ کے کمیسار کو بھی مشکل مرحلہ پیش آجائے اور وہ یہ محسوس کرے کہ اس کی پالیسی ایک دو یا تین ڈکٹیٹروں کی پالیسی سے متضاد ہے تو وہ صرف وقار سے محروم نہیں ہوگا بلکہ اسے اُس سے بدتر نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔



بہرحال یہ حقیقت قائم ہے خواہ اس سے پیدا ہونے والی کچھ تشویشیں بے بنیاد ہی کیوں نہ ہوں کہ اب پالیسیوں کی تشکیل پر کروڑوں اشخاص کے خیالات اور رویّے کا اثر پڑتا ہے اور یہ اثر اہم ہوتا ہے۔ ان کروڑوں اشخاص میں کچھ لوگ صورتِ حال سے آگاہ ہوتے ہیں کچھ غلط فہمی میں مبتلا اور کچھ بیگانۂ محض۔

یہ دلیل اکثر پیش کی جاتی ہے کہ عوام النّاس جو قوّت کے آخری امین ہوتے ہیں اپنی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بڑی دقّت محسوس کرتے ہیں اور کڑے فیصلے کرنا اُن کے لئے

مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جب
جمہوریت اس معاملے میں نامکمل ثابت ہوئی۔'

• تیئس ۲۳ سو سال پہلے یونان کی خالص اگرچہ محدود جمہوریت میں عوام اور لیڈروں
کے درمیان رُو در رُو تعلق قائم ہوتا تھا۔ اسی قسم کے تعلق کا اب ٹیلی ویژن کے ذریعہ احیاء
ہو رہا ہے اگرچہ اس کے نتائج بسا اوقات قدرے مشکوک ہوتے ہیں۔ بہرحال اس قسم کا براہِ راست
رابطہ یقین پیدا کرنے میں آج کی طرح ان دنوں میں بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔
آپ کو یاد ہوگا کہ یونان کی اسمبلی کو مقدونیا کے فلپ سے پیدا ہونے والے خطرے سے ہوشیار
کرنے کے لئے ڈیموستھینیز نے کتنی کوششیں کی تھیں لیکن وہ اتنا ہی ناکام رہا تھا جتنے ۱۹۳۰ء
کے بعد کے چند برسوں میں ونسٹن چرچل برطانیہ کی پارلیمان کو نازیوں کے خطرے سے ہوشیار
کرنے میں ناکام رہے تھے۔

تھیوسیڈائڈز نے ہمیں بتایا ہے کہ ۴۲۷ قبل مسیح میں کلیون نے اسمبلی سے کس طرح
خطاب کیا تھا۔ اس نے کہا تھا "مجھے اس سے پہلے بھی احساس ہوا ہے کہ جمہوریت کا سلطنت کے ساتھ
نباہ ناممکن ہے..." جمہوریت کی نااہلیت کی وجہ کلیون نے یہ بتائی تھی کہ اسمبلی کے ممبر یہ بھول
جاتے ہیں کہ باقی لوگ ان جیسے نہیں۔ اس نے کہا تھا "اس معاملے کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے
کہ پالیسیاں مسلسل بدلتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممبر اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایک شہر
کے لئے وہ برے قانون جو کبھی تبدیل نہ ہوں ان اچھے قوانین سے بہتر ہیں جن کے پیچھے کوئی قوت نہ
ہو۔" کلیون نے اپنی پبلک کا نقشہ خود ان کے سامنے ان لفظوں میں کھینچا تھا:

"جو لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں وہ تم ہو۔ تم جو اتنے احمق ہو کہ اس قسم کی
بحثوں کا آغاز کر دیتے ہو۔ تم تقریریں اس طرح سنتے ہو جیسے تماشا دیکھ رہے
ہو۔ تم واقعات کا اندازہ سنی سنائی باتوں سے کرتے ہو اور کسی تجویز کے عملی

کی صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی آنکھوں پر نہیں، اپنے کانوں پر بھروسہ کرتے ہو۔ تم کسی چالاک نکتہ چیں کے ان لفظوں پر بھروسہ کر لیتے ہو، جو تمہارے کان میں پڑ جائیں۔"

اِس تقریر میں دورِ حاضر کی گونج سنائی دیتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ آج کل کے سیاستدان اپنے ووٹروں سے اس قسم کی باتیں اکثر کہتے نہیں۔

تقریباً چھبیس ۲۶ سو سال بعد مسٹر والٹر لپمان نے اس بات کا تجزیہ کیا تھا کہ حکومت کی پالیسی طے کرنے والوں کو جب متعدد اختیاراتِ پسند کا جو ایک دوسرے سے وابستہ ہوں، سامنا ہو جائے تو متوازن انتخاب کی حدیں کیا ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے خاتمۂ کلام ان لفظوں پر کیا تھا:

"جب سخت اور نرم پالیسی میں انتخاب کرنے کا مسئلہ سامنے ہو تو جمہوری حکومتوں کا عام رجحان یہ ہوتا ہے کہ ووٹروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو خوش کیا جائے۔ ووٹروں کا دباؤ عام طور پر نرم پالیسی کی طرف ہی پڑتا ہے[1]"

اس سے مسٹر لپمان نے یہ مایوس کن نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک جمہوری سیاست داں کے لئے محفوظ راستہ یہ ہے کہ جب تک ٹھیک بات کہہ کر مقبول ہونے کا امکان پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ غلط بات ہی کہتا رہے۔ اس کے لئے یہ بات زیادہ پرکشش ہوتی ہے کہ وہ حقائق کی بجائے رائے عامہ کا ساتھ دیتا رہے۔

مسٹر لپمان اس کا الزام رائے عامہ کے اس دباؤ پر لگاتے ہیں جو حکومت پر ڈالا جاتا ہے وہ اس کا الزام عوامی رائے کی متضاد نوعیت پر لگاتے ہیں جس کا دباؤ مطلوبہ پالیسیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک "جس حد تک ان لوگوں کی تعداد جنھیں اطلاع پہنچانا اور قائل کرنا ضروری ہو، بڑھتی جاتی ہے یا مختلف النوع ہوتی جاتی ہے اسی اعتبار سے رائے عامہ کی

حقیقت پسندی میں کمی ہوتی جاتی ہے۔[5] وہ محسوس کرتے ہیں کہ رائے عامہ کے دباؤ کی متضاد اور انتشار پیدا کرنیوالی نوعیت کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک اسی پر ہے۔ ان کے نزدیک رائے عامہ کا یہ رجحان زیادہ سے زیادہ پُرجوش، ضدی اور غالب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جہاں رائے عامہ غالب آجائے وہاں طاقت کے حقیقی عوامل میں مریضانہ انتشار پیدا ہو جاتا ہے"۔

یہ تسلیم کرنے کے لئے کہ مسٹر لپمان نے ایک ایسے خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے جو پالیسی کی تشکیل اور اس کے کنٹرول میں عوام کے براہِ راست دخل میں اضافے سے واقعی پیدا ہو سکتا ہے ان کے تمام نظریئے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ اگر اس قسم کا کنٹرول ذمہ داری اور ضبط سے استعمال نہ کیا جائے تو یہ یقینی طور پر اس قسم کے اخلاقی اور ذہنی زوال میں مدد دے سکتا ہے جو تاریخ میں ہمیشہ بڑی بڑی سوسائیٹیوں کی شکست و ریخت کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے خواہ یہ شکست داخلی طور پر رونما ہو خواہ بیرونی خطرے کا نتیجہ ہو۔



اگر ہم گذشتہ پچاس سال کی بین الاقوامی سیاست کے ایک دو پہلوؤں پر نظر ڈالیں تو اس سے اس خطرے کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ سیکھنے کا ایک طریقہ آزمائش اور غلطی ہے۔ ہمارے یہاں ان دونوں کی فراوانی رہی ہے لیکن تجربہ اگرچہ حصولِ دانش کا ایک قیمتی ذریعہ ہے لیکن بجائے خود یہ دانش کی ضمانت ہرگز نہیں۔ پھر تجربے کے مفید ہونے کا انحصار زیادہ تر اس بات پر نہیں کہ کسی شخص کے گرد و پیش کتنے واقعات رونما ہوئے ہیں بلکہ اس کا انحصار اس شخص کی آگاہی کی شدت اور نوعیت پر ہے۔ ہمیں نپولین کی اس تنقید کو یاد رکھنا چاہیئے جو اس نے اس وقت کی تھی جب کسی نے اس کے ایک افسر کی ترقی کی سفارش اس بنا پر کی تھی کہ اس نے معرکوں کی غیر معمولی تعداد میں حصہ لیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نپولین نے اس کا جواب یہ دیا تھا "میرا گھوڑا اس سے کہیں زیادہ معرکوں میں شریک ہوا ہے"۔ فریڈرک اپنے جرنیلوں سے یہ خلش پیدا کرنے والا سوال پوچھا کرتا تھا "تمہارا تجربہ کس کام کا اگر تم نے اس پر غور نہیں کیا؟"

اگر ہمیں اپنے تجربے پہ غور کرنا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے تو پہلا قدم اسکی یاددہانی ہونا چاہیئے۔ میں صرف ایک معاملے میں ایسا کروں گا۔

تیس سال پہلے امریکہ کے بہت سے لوگوں کا رجحانِ فکر علیحدگی پسندانہ تھا۔ امریکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد، غالباً اکثریت اپنے آپ کو ان واقعات سے بہت دور محسوس کرتی تھی، جو یورپ میں رونما ہو رہے تھے اور اسے اس دوری کا ہرگز ہرگز کوئی افسوس نہیں تھا۔ یہ لوگ اگر اس سے بے پروا نہیں تھے تو بہ ظاہر اس سے بے خبر ضرور تھے کہ ان دور دراز رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ خود اُن کی اپنی تقدیر وابستہ ہے۔

کنیڈا کے باشندوں نے اپنی تاریخ اور روایات کی بنا پر یورپ سے دوری کا احساس اس حد تک ہرگز نہیں کیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ علیحدگی پسندی کو ان کے مزاج میں کوئی دخل نہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کی لڑائیوں میں کنیڈا کی شرکت اسی رویّے کا نتیجہ تھی۔ اس شرکت کو اس رویّے کا باعث بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال سنہ ۱۹۳۹ء میں ایسے کنیڈین کافی تھے اور امریکن تو اس سے بھی زیادہ تھے جو یہ امید رکھتے تھے کہ ہم یورپ کی کشمکش سے بچ کر نکل سکتے ہیں۔ ٹیکس کے بل اُن کے کانوں پہ پردہ ڈال دیتے تھے اور گذشتہ بڑی جنگ کے آنسو اُن کی آنکھوں پہ۔

بہرحال اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں یورپ کی کشمکشوں سے الگ رہنے کے سلسلے میں کنیڈا کی حکومتوں کے سامنے ایک اور مقصد بھی تھا جو کچھ کم مؤثر نہیں تھا۔ اس کا تعلق اس بات سے تھا کہ یورپ کے مسائل کے متعلق کنیڈا کے عوام کے مختلف حصّوں میں زبردست اختلافِ رائے تھا۔ اس اختلافِ رائے کا تعلق اُن کے صحیح یا غلط ہونے سے بھی تھا اور ان کی تشویشناکی سے بھی۔ کچھ ایسے کنیڈین بھی ضرور تھے اور ایسے امریکن تو اس سے بھی زیادہ تھے جو اس خوشگوار واہمے میں مبتلا تھے کہ سمندر اُن کی حفاظت کے لئے کافی ہیں اور ان کا ملک یورپ کی کشمکش سے الگ اور غیر متاثر رہ کر محفوظ رہ سکتا ہے لیکن کنیڈا کی

گریز کیا تو اس کی وجہ زیادہ تر یہ نہیں تھی کہ وہ واقعی یہ خیال کرتی تھی کہ اس طرح وہ جنگ کی صورت میں آئندہ فوجی ذمہ داریوں سے واقعی بچ جائے گی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اگر عام قسم کی نیک دلانہ باتیں کہنے کے علاوہ وہ کسی زیادہ واضح رائے کا اظہار کرتی تو اسے فوراً ہی اپنے گھر میں سیاسی اختلافات کا سامنا ہو جاتا۔

اگر دوسری بڑی لڑائی سے پہلے کے دس برسوں میں شمالی امریکہ خواہ تحفظ کے غلط احساس کی بنا پر اور خواہ شدید اختلاف رائے سے پیدا ہونے والی کمزوری کی بنا پر بین الاقوامی سیاست میں غیر مؤثر رہا تو یورپ کی جمہوریتوں کا طرز عمل بھی کچھ زیادہ مستحسن نہیں تھا بلکہ شمالی امریکہ سے بھی کم مستحسن تھا۔ وہ خطرے سے کہیں زیادہ قریب تھیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس خطرے کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ بعض ملکوں میں اس انکار کو قوت ارادی کے مفلوج ہو جانے سے بھی مدد ملی اور قوت ارادی کا فالج غلط پالیسیوں اور غلط قسم کے ضدی پن سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس معاملے میں ذہنی غلطی کو بھی کافی دخل تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری ایک قسم کے روحانی اندھے پن پر عائد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ زیادہ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ بعض اوقات خطروں کو قبول کرنے پر آمادگی امن اور جنگ دونوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے بلکہ یہ کہ اس کے ضروری یا غیر ضروری ہونے سے قطع نظر وہ ان ذمہ داریوں اور قربانیوں کے لئے آمادہ ہی نہیں تھے جو اس قسم کے اقدام کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔



اس صدی کی تیسری دہائی میں مغربی جمہوریتیں پستی کی ایک ایسی منزل میں پہنچ چکی تھیں جس کا گھریلو سیاسی اداروں اور خارجی ڈپلومیٹک طریقوں سے بہت کم تعلق تھا بلکہ بالکل نہیں تھا۔ اس کا اس وقت کی علمی یا ذہنی سطح سے تعلق اس سے بھی کم تھا۔ یہ پستی ایک طرح کے اخلاقی دیوالیہ پن کی مظہر تھی جو سوسائٹیوں پر بھی مسلط تھا اور ان لوگوں پر بھی جن کا مجموعہ یہ سوسائٹیاں تھیں۔

خارجہ پروگرام اور گھریلو معاملات میں بھی یہ دہائی پستی کا مظہر تھی۔ اس دور میں ٹیکنیکل میدان میں بڑی ترقیاں ہوئیں لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک سماج ٹیکنیکل میدان میں آگے بڑھے اور باقیوں میں پیچھے ہٹ جائے۔ اقتصادی بحران صرف ایک ٹیکنیکل معاملہ ہرگز نہیں تھا - یہ متناقض صورتِ حال واقعی اہانت انگیز تھی کہ مادّی ذرائع کی فراوانی کے باوجود لوگ بے کار اور بھوکے رہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ بحران اخلاقی بصیرت اور ہمارے سماج کے سماجی مقصد کی ناکامی کا مظہر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے سماج نے اس حقیقت کو تقریباً تقریباً فراموش کر دیا ہے کہ کسی قوم کے وسائل میں سب سے زیادہ اہمیت انسانوں کو حاصل ہوتی ہے اور ہر اقتصادی عمل کا مقصد ان ہی کی بہبود ہے۔

اس کے بعد ایک ظالمانہ اور بے رحمانہ لیکن نجات آفریں تجربہ سامنے آیا۔ اس دہائی کے اخیر میں ایک بالاتر اور منضبط سماجی مقصد اپنی ترقی یافتہ شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ (یہ اور بات ہے کہ یہ مقصد جنگ کی وجہ سے سامنے آیا تھا جسے جمہوری حکومتیں روک بھی سکتی تھیں بشرطیکہ انھیں چند سال پہلے اس کا احساس ہوا ہوتا) جس نے حکومتوں اور عوام کو یہ سبق ذہن نشیں کرا دیا کہ جو مقصد سماجوں کے لئے مادّی طور پر ممکن الحصول اور ذاتی طور پہ مستحسن الحصول ہے وہ مالی اور سیاسی اعتبار سے بھی ممکن الوجود ہے۔



اگر میں تیسری دہائی میں جمہوری سماج کی ان خامیوں کا جنھیں مختصر الفاظ میں خارجہ پالیسی اور گھریلو بحران کی بدمزگی کا نام دیا جاسکتا ہے ذکر کر رہا ہوں تو اس کا مقصد اس نکتے کی تشریح کرنا ہے کہ داخلی یا خارجی سیاست میں جمہوریت کی چاہے کتنی ہی حکمرانی ہو وہ اِس بات کی ضمانت نہیں بن سکتی کہ اس کی بنا پہ طریق کار کا جو فیصلہ کیا جائے گا وہ لازمی طور پہ اچھا ہوگا یا جو راستہ مقصد رسی کے لئے اختیار کیا جائے گا وہ صحیح ہی ہوگا -

اس کی بنا پہ ہمیں یہ اندازہ بھی ہو جانا چاہیئے کہ ایک جمہوری سماج میں جب ضرورت

بھی تیز ہوجاتی ہے۔

اور بالآخر اس تیسری دہائی کے واقعات کی یاددہانی کا مقصد موجودہ بے دلی کا تدارک ہے جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ہم نے سیاسی قوت اور صحت کی بحالی کے لئے اُس وقت سے اِس وقت تک بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں تو حوصلے پست نہیں رہتے خواہ ان کامیابیوں کیلئے ہمیں جنگ کی بھیانک قیمت ہی ادا کرنی پڑی ہو۔

مسٹر لیمان نے ہمیں جس بیماری سے خبردار کیا ہے یعنی حقیقت کا مقابلہ کرنے یا ضروری مگر کڑے فیصلے کرنے میں ہچکچاہٹ اور تذبذب وُہ میرے نزدیک ایک سیاسی یا آئینی نظام کی حیثیت سے جمہوریت کی ناگزیر خامی نہیں۔ میرے نزدیک یہ زیادہ تر افراد کے داخلی انتشار کا نتیجہ ہے۔ یہ بیماری جو متعدی بھی ہے کسی بھی سماج کو لاحق ہوسکتی ہے اگر اس کے کافی رُکن جو سیاسی رسوخ کے حامل ہوں اپنے مخصوص خودغرضانہ اور مصنوعی مفاد کے مقابلے میں اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوجائیں۔



نیابتی جمہوریت اور دوسری قسم کی سیاسی تنظیموں میں اس اعتبار سے اگر کوئی بنیادی فرق ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اول الذکر میں ہر شہری ایک ووٹر کی حیثیت سے فیصلے پر اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا رویہ سیاسی واقعات پر فوری اور اہم اثر ڈال سکتا ہے۔ اگر اکثریت کا اخلاقی رُجحان صحیح ہو تو یہ بات قوت کا باعث ہے۔ یہ ایک ایسا اندوختہ ہے جس سے سماج بروقت فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ یہ بات دوئم درجے کے یا مشکوک قسم کے لوگوں کو مقتدرانہ حیثیت سے محروم کرسکتی ہے یا انھیں یہاں تک پہنچنے سے روک سکتی ہے۔ دوسری طرف ایسے سماجوں میں جہاں شخصی یا ایک مخصوص یا منتخب طبقے کی حکمرانی ہو وہاں صرف چند لوگوں کی روحانی اور ذہنی خامی ایک بڑی سلطنت کے انتشار کا باعث بن سکتی ہے جیسا کہ ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت کا حشر ہوا تھا۔

اس صورت میں میرا خیال یہ ہے کہ جمہوریتوں میں دوسرے سماجوں کے مقابلے میں

اس سیاسی بیماری کی پذیرائی کا رجحان نسبتہً زیادہ ہرگز نہیں ہوتا جو جمہوریتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

اس بیماری کو میں نے کردار سے محرومی اور اخلاقی سیرت کی کمزوری کا نام دیا ہے۔

مثال کے طور پہ ایک شورش پسند بازاری لیڈر صرف اس تملق پیشہ درباری کا جمہوری پیکر ہے جو ایک خود مختار حکمراں کے دربار میں مطلب برآری کیا کرتا تھا۔ یہ بازاری لیڈر زیادہ لوگوں تک پہنچ ضرور سکتا ہے۔ لیکن میں کہوں گا کہ یہ کسی پالیسی پہ اتنا فیصلہ کن اثر ہرگز نہیں ڈال سکتا جتنا ایک درباری ڈال سکتا تھا۔ مائیکروفون کے سامنے شورش پسند لیڈر کی چنگھاڑیں اس معاملے میں اتنی مؤثر ہرگز نہیں جتنی ایک حکمراں یا جابر کے کان میں تملق پیشہ درباری کی سرگوشی۔

جس طرح خود مختار حکمران اُن درباریوں کی ریاکاری اور غیر مخلصی کا شکار ہو جاتے تھے جو بادشاہ کو سچی بات بتلانے کی بجائے وہ بات بتایا کرتے تھے جسے اُن کے نزدیک حکمراں سُننے کا آرزومند تھا اسی طرح جمہوریتیں بھی ان لوگوں کے غیر مستحسن اوصاف سے بالکل مامون نہیں جو کسی نہ کسی طرح اقتدار اور قوت کی مسند پہ پہنچ جانے کے آرزومند ہیں۔

یہ بیماری صرف شورش پسند سیاستین کو ہی لاحق نہیں ہوتی۔ یہ فارن سروس یا سول سروس یا حکومت اور کاروبار کے کسی بھی اِدارے کو لاحق ہو سکتی ہے جس کے افسر اپنی رپورٹوں اور اپنی تجویزوں کی بنیاد صورتِ حال کے متعلق اپنے ایماندارانہ فیصلوں پہ نہ رکھیں بلکہ اس اندازے پہ رکھیں کہ کوئی مخصوص تجویز انھیں مقبول بنا کر اب اُن کی ترقی کا باعث کہاں تک بن سکتی ہے یا دس سال بعد غیر مقبول ہو کر ان کی برطرفی کا سبب کس حد تک ٹھہر سکتی ہے۔

یہ ایک پیشہ ورانہ خطرہ ہے جو ایمانداری، قوت اور اخلاقی جرأت والے لوگوں کو اس سفر میں ضرور برداشت کرنا پڑے گا۔

اسی طرح جمہوری حکومت کے اصول اور عمل میں ایسی کوئی بات نہیں جو پبلک خدّام

کرتی ہو۔ سیاست کی بہترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسا فن ہے جو امکانات کی حدوں کا پابند،
یہ بات دانشمندانہ ہی نہیں بلکہ مفید اور ناگزیر بھی ہے کہ عملی سیاستدان کو کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے
یہ اندازہ ضرور لگا لینا چاہیئے، کہ پبلک میں کسی خاص طرزِ عمل کی پذیرائی کہاں تک ہے۔ بالعموم وہ
اس بات کا فیصلہ ضرور کر لیں گے کہ کسی تجویز کو پیش کرنے کا صحیح وقت اور صحیح طریقہ کونسا ہے لیکن
یہ بات اپنے اس فیصلے کے خلاف کام کرنے سے بالکل مختلف ہے جس کے تمام امور پر غور کرنے کے بعد
قوم کے مفاد متقاضی ہوں۔ دوسری بات غداری کی ایک شکل ہے۔

جمہوریت کا بنیادی سیاسی اصول وہ ہے جسے ذمہ دارانہ حکومت کہا جاتا ہے
یعنی یہ مد کہ اگر حکومت اپنے اقتدار کا استعمال اس طرح کرے کہ اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو
تو ووٹر اسے برطرف کر سکتے ہیں۔ اس اصول کی بنیاد اس مفروضے پر کسی طرح نہیں جو تاریخ
کے مختصر ادوار کی روشنی میں بھی نمایاں طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اکثریت کی رائے
ہر معاملے میں لامحالہ طور پر درست ہوتی ہے بلکہ اس اصول کی بنیاد اس صحیح نظریئے پر ہے کہ
عمدہ طریقِ طبخ کا بہترین فیصلہ وہ شخص نہیں کرتا جو کچن میں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ شخص جو کھانے
کے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے خواہ وہ کھانا پکانے کا ماہر نہ بھی ہو۔



جہاں تک مجھے علم ہے کسی بھی جمہوری آئین نے جو قصبے کی میٹنگ کی سطح سے بلند تر
ہے آج تک یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حکومت کو ہر مسئلے میں اکثریت کی رائے کی تقلید کرنی چاہیئے۔
اس کے برعکس جمہوری آئین کا جو منشا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت یا تو مجلس آئین کے سامنے جوابدہ
ہے یا پانچ سال کے وقفوں کے بعد ووٹروں کے سامنے۔ جہاں اکثریت کے عقیدے کی مسلسل
توہین حکومت کو ناممکن بنا دے گی وہاں ایسی آئینی یا سیاسی ضرورت بھی کوئی نہیں جو حکومتوں
کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ وقتی جذبات کے رحم و کرم پر رہیں اور رائے شماری یا عوامی دباؤ
کی بنا پر ایسے راستوں کو اختیار کریں جو ان کے علم کے مطابق غلط ہوں۔

میرے خیال میں جمہوریت کو اس وقت تک جو بہترین خادم ملے ہیں ان میں ایک

... ہیں اپنے ووٹروں سے جنہوں نے اس کی میعادِ
رُکنیت کے وسط میں اسے انفرادی مسائل کے متعلق اپنی رائے کا پابند بنانے کی کوشش کی تھی، جو بات کہی تھی وُہ اس قابل ہے کہ اُسے آج بھی دُہرایا جائے۔ اس نے کہا تھا:

"میں نے تمہاری ہدایات کی پابندی نہیں کی۔ نہیں، میں نے ان ہدایات کی پابندی کی جو صداقت اور فطرت کی طرف سے مجھے ملی تھیں۔ میں نے تمہاری رائے کے برعکس تمہارے مفاد کی حمایت کی اور اسی ثابت قدمی سے کی جو میرے شایانِ شان تھی، ایک ایسا شخص جو تمہاری نمائندگی کا اہل ہو اُسے ثابت قدم ہونا چاہیئے۔ مجھے تمہاری رائے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس رائے کی طرف دیکھنا چاہیئے جو میں اور تم آج سے پانچ سال کے بعد قائم کریں گے۔ مجھے واقتی نام و نمود کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم نے مجھے باقی لوگوں کیطرح میرے منصب کے لئے اس لئے منتخب کیا ہے کہ میں ریاست کا ایک ستون ثابت ہوں۔ میرے انتخاب کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میری خفیف الحرکاتی اور ہر سمت پہ چلنے کی صلاحیت کی بنا پہ مجھے ایک مرغِ بادنما کی طرح کنگرے پہ رکھ دیا گیا ہے جس کا اِس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا کہ وُہ ہر وقتی ہوا کی نشان دہی کرتا ہے"۔

یہ ۱۷۸۰ء کی بات ہے۔ اپنے ووٹروں کو اس نے چھ سال پہلے ہی نوٹس دے دیا تھا کہ پارلیمان کے ایک ممبر کے فرض کے متعلق اس کا تصوّر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ تصوّر صحیح تھا۔ سُنیئے اُس نے کہا تھا:

"حضرات! ایک نمائندے کے لئے یہ بات یقینی طور پہ مسرّت اور عظمت کا باعث ہونا چاہیئے کہ وُہ اپنے حلقۂ انتخاب ...

قائم رکھے، ان کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھے اور ہم مشربی میں کوئی
فرق نہ آنے دے۔ اُن کی خواہشات کو اسے بہت وزن دینا چاہیئے، اُن
کی آراء کا احترام کرنا چاہیئے اور اُن کے کام کو اُسے اَن تھک توجہ کا مستحق
سمجھنا چاہیئے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے آرام، اپنی خوشی اور اپنے اطمینان
کو اُن کے آرام، خوشی اور اطمینان پر قربان کر دے اور ان سب سے بالاتر
یہ کہ اسے ہر معاملے میں ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینی چاہیئے۔

"لیکن اپنی غیر متعصبانہ رائے، اپنے پختہ اور بالغ نظرانہ فیصلے اور اپنی
روشن ضمیری کو اُسے تم پر، کسی اور انسان پر یا انسانوں کے کسی اور گروہ
پر ہرگز ہرگز قربان نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ چیزیں نہ تو وہ تمہاری مرضی سے
حاصل کرتا ہے نہ ضوابط اور نہ آئین سے۔ یہ خدا کی امانت ہیں اور
ان کے ناجائز استعمال پر اس سے شدید جواب طلبی ہوگی۔ تمہارے نمائندے
کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ تمہارے لئے کام کرے بلکہ اسے صحیح فیصلے بھی
کرنے چاہئیں۔ اگر وہ اس چیز کو تمہاری خدمت کے لئے وقف کرنے کی بجائے
تمہاری رائے پر قربان کر دے تو وہ غداری کا مرتکب ہے۔"

برک کو اس نظریے سے یقیناً اختلاف تھا کہ مجلسِ آئین ساز کے ممبر صرف اپنے ووٹروں کے
ایجنٹ ہوتے ہیں جن کا یہ فرض ہے کہ وہ مقامی تعصبات کی ترجمانی کریں، یا کسی لابی
یا مقامی مفادات کے دباؤ کے مطابق اپنا ووٹ دیں۔ اس نے بغیر کسی تذبذب کے
اپنے ووٹروں سے کہہ دیا تھا:

"پارلیمان ایک ایسی مجلسِ مشاورت ہے جو ایک قوم اور ایک
مفاد کی ترجمان ہے۔ یہ پورے ملک کی نمائندہ ہے۔ یہاں مقامی تعصبات
یا مقامی مقاصد کو نہیں بلکہ مجموعی مفاد کو جو تمام ملک کے مجموعی غور و فکر

... جب ہم
اُسے منتخب کر چکتے ہو تو وہ برسٹل کا ممبر نہیں ہوتا بلکہ پارلیمنٹ کا ایک ممبر
ہوتا ہے۔ اگر مقامی حلقۂ انتخاب کا کوئی مفاد ایسا ہو یا وہ جلد بازی میں
کوئی ایسی رائے قائم کرے جو باقی قوم کے حقیقی مفاد سے متضاد ہو تو اس کے
منتخبہ ممبر کو بھی اس کی تکمیل سے اتنا ہی دُور رہنا چاہیئے جتنا کسی اور کو۔"

۱۹۵۵ء میں ان الفاظ پر یہ گمان گذر سکتا ہے کہ وہ اکملیت کی تلقین ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اوپر کے الفاظ صرف ایک ایسی تجویز کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر عمل کرنا کسی بھی جمہوری سماج کی سیاسی صحت کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے۔ جمہوری سماج کا بنیادی عنصر اتنا سیاسی نظام یا آئینی ڈھانچہ نہیں ہوتا جتنا افراد کا کردار۔ یہ بات ہمیشہ کے لئے سچ ہے۔ جو بات برک نے اپنے دو نمبروں سے کہی اُسے ایک امریکن نے زیادہ مختصر الفاظ میں کہہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"میں صدر بننے کی بجائے راستی پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

اس بات پر زور دینے سے کہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کے لئے افراد کا کردار بُنیادی عنصر ہے، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں آئینی طریقوں اور سیاسی اداروں کی قدر و قیمت کو کم ثابت کروں۔ اس قسم کے اداروں کے جو فائدے ہیں اُن میں ایک فائدہ یہ ہے کہ وُہ ماضی کی سیاسی بصیرتوں کے حامل ہیں اور اس طرح سابقہ نسلوں کی دانش، ضبط اور ان کے اوصاف کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔

مثال کے طور پر میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ شاہی کی وجہ سے کنیڈا کو بیشتر جمہوریتوں کے مقابلے میں زیادہ سودمند حیثیت حاصل ہے۔ ریاست کے رئیس اعلیٰ کی حیثیت سے ملکہ جو حکومت نہیں کرتی اور حکومت کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وزیرِ اعظم جو حکومت کرتا ہے، کے درمیان فرق لوگوں کے لئے حکومت کے شکوہ اور کسی مخصوص حکومت کی سرگرمیوں کے درمیان جو ہمیشہ پُرشکوہ نہیں ہوتیں امتیاز کرنا آسان بنا دیتا ...

اور اس کی کلیت جس میں ماضی، حال اور مستقبل سب شامل ہیں، کی نمائندگی جتنے ڈرامائی انداز میں شاہی کرتی ہے اتنا کوئی اور مظہر جو اس سے کم غیر شخصی ہو، نہیں کر سکتا۔ یہ مظہر لوگوں کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ ریاست کی خدمت کے فرائض انجام دیتے ہوئے انھیں کسی ایسی چیز کی خدمت کرنی ہے جو ہنگامی ووٹروں سے بلند تر ہے۔

اس کے ساتھ ہی میرا خیال ہے، جو بہت ممکن ہے میرے تعصّبات کا نتیجہ ہو کہ ہمارا پارلیمانی نظام جس میں کابینہ کے ممبر اسمبلی کے رکن اور اس کے سامنے جواب دِہ بھی ہوتے ہیں۔ امریکہ کے کانگریسی طرز کے نظام کے مقابلے میں کئی اعتبار سے بہتر ہے۔ ایک بات یہ کہ ذمّہ دارانہ حکومت کے پارلیمانی طریقے کا مطلب یہ ہے کہ کابینہ کو انتخاب کی تطہیر کرنے والی آزمائش میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ کابینہ غیر منتخب وزیروں کے مقابلے میں مجلسِ آئین ساز سے قریب تر ہوتا ہے۔

ہمارے نظام میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر حکومت اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ یہ بات پارلیمنٹ کے ممبروں کو مخصوص مفاد کے نسبتاً وقتی اور مقامی دباؤ کے مقابلے میں پارٹی کی وحدت کا زیادہ احترام کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ وہ اپنی طاقت اپنے ساتھیوں کی اکثریت کے ساتھ ہی قائم رکھ سکتا ہے اور اسے علم ہے کہ عام چناؤ کی قیمت ادا کیے بغیر حکومت کو کسی خاص موقع پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

اس اعتبار سے کنیڈا کی پارلیمنٹ کے ممبر یا برطانیہ کے دارالعوام کے ممبر امریکہ کی کانگریس یا سینٹ کے ممبروں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی طاقت رکھتے ہیں جو مواخذہ کرنے کا انتہائی قدم اٹھائے بغیر انتخاب کے معیّنہ وقفے کے دوران ایگزیکٹو کو الگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری طرف ہمارا پارلیمانی نظام انفرادی آئین سازوں میں پارٹی کی وحدت کے لئے معتمدانہ

انتخاب کا اس کی تمام بے یقینیوں کے ساتھ جو ذاتی بھی ہوتی ہیں اور سیاسی بھی، سامنا کرنا پڑ جائے، یہ بات ایگزیکیوٹو کو کافی اقتدار دے دیتی ہے۔ اگرچہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ یہ اقتدار بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ مجلس آئین ساز یا ایگزیکیوٹو کی طرف سے اختیارات کے ناجائز استعمال پر جوابی پابندیاں بھی لگاتا ہے۔

مختلف جمہوری نظاموں کے نسبتی فائدوں کے باوجود گزشتہ تیس سال کے تجربے نے ایسی نمایاں مثالیں پیش کی ہیں جب ہر قسم کی جمہوریت نے ایسے کڑے اور ضروری فیصلے کرنے اور مناسب کارروائیاں کرنے سے گریز کیا جو صورتِ حال کا تقاضا تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بیشتر جمہوری حکومتوں نے جن میں سب سے نمایاں طاقتور ترین ملک امریکہ ہے ایسی ذمہ داریوں کو قبول کیا ہے اور برداشت کیا ہے جن کی زمانہ امن میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

جس بنیادی نکتے کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں جمہوریتوں کے لئے بعض مسائل ایسے ہیں جو نہ تو بیرونی صورتِ حال کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں اور نہ اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان مسائل کا ڈپلومیٹک طریقوں اور آئینی طریقِ کار کے ساتھ بھی کوئی خاص تعلق نہیں۔ میں ان مسائل کو اپنے سماج کے ماحول، کردار اور اس کی اخلاقی بنیادوں کا نام دوں گا۔ یہ کہنا حماقت ہوگا کہ سیاسی دنیا میں ہمارے مستقبل کا انحصار کلیتہً ہمیں پر ہے کیونکہ ہم میدان میں اکیلے نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بات شبہہ سے بالاتر ہے کہ باقی امور کی طرح خارجہ پالیسی میں بھی ہمارے مستقبل کا انحصار کسی اور بات کے مقابلے میں اس داخلی عنصر پر کہیں زیادہ ہوگا۔ ہمارے مستقبل کا انحصار ان باتوں پر ہوگا کہ قوموں کی حیثیت سے ہمارے اوصاف کیا ہیں، ہمارے اعتقادات کیا ہیں اور ہم حامی کن چیزوں کے ہیں۔

حکومت کی پالیسیوں اور اس کے طریقوں پر میں جتنی بھی نظر ڈالتا ہوں اتنی ہی مجھے یہ بات حیرت انگیز نظر آتی ہے کہ سنجیدہ اور ذہین لوگوں نے کسی نہ کسی شکل میں جبرِ تاریخ کے نظریئے کو فروغ دیا یا اسے تسلیم کیا۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے اس بات کو مان لیا کہ ہم تقدیر کے غلام ہیں یا اس کے ہاتھ میں کھلونے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ قابلِ تسلیم اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان کا ذہن اخلاقی پشت پناہیوں سے محروم ہو جائے۔

نظریۂ جبر کے تمام تصوّروں کی بنیاد لازمی طور پر اسی قسم کی سپر اندازی پر ہوتی ہے۔ یہ بات تمام مسئلے کو صرف دھندلا ہی نہیں دیتی بلکہ داغ دار کر دیتی ہے کیونکہ جو چیز زندگی، تاریخ اور سیاست کو حقیقی اہمیت عطا کرتی ہے وہ انسانوں اور قوموں کی یہ قدرت ہے کہ وہ صرف اپنے ماحول کا تتبع نہیں کرتے بلکہ وہ مثبت عمل کے بھی اہل ہیں اگرچہ وہ ایسا ہمیشہ کرتے نہیں۔ کسی نہ کسی حد تک یہ صحیح ضرور ہے کہ تمام انسان ان محرّکات کو جو ماضی کے تشکیل کردہ ہوتے ہیں مستقبل میں منتقل کر دیتے ہیں اور بیرونی محرکات کے مطابق میکانکی طور پر عمل بھی کرتے ہیں لیکن انسان اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں، وہ اگر چاہیں تو اس صورتِ حال کو تبدیل کر سکتے ہیں جو اُن کے گرد و پیش موجود ہو اور کسی نہ کسی حد تک وہ کرتے بھی ہیں وہ مثبت اور تخلیقی عمل کر سکتے ہیں جو ماحول کی صرف پیداوار ہرگز نہیں ہوتا۔ لیکن ایک ماہر درزی کے تیار کیئے ہوئے کپڑوں کی طرح ماحول کے مطابق ضرور ہوتا ہے۔

ہمارے اس تمام عقیدے کی بنیاد کہ انسانوں یا قوموں سے تعمیری کام ممکن ہے لازمی طور پر اس مفروضے پر قائم ہے کہ آدمی اور اس کا ذہن صرف ماحول و وراثت کی پیداوار نہیں اور اس کے لئے رُوح کی غیر محدود اور غیر مشروط دُنیا سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہے لہٰذا رائے عامّہ اور سیاسی قوّتِ فیصلہ سے جن باتوں کی آئینہ داری ہوتی ہے ان میں یہ بات بھی ہے کہ اس قسم کے فیصلے کرنے والوں کی اخلاقی بصیرت کا عالم کیا ہے اور اُن کا رُوحانی قد کیا ہے۔ یہ بات

میں نے یہ بات اکثر سنی ہے اور آپ نے بھی سنی ہوگی کہ حکومتیں بالخصوص خارجہ پالیسیوں میں اپنے ملکی مفاد کی تکمیل اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر کرتی ہیں۔ یہ فیصلہ میرے خیال میں کئی حقیقی سوالوں کو بمنزلۂ ثبوت مان لینا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومتیں اپنی سمجھ کے مطابق قومی مفاد کی تکمیل کرتی ہیں اور ایسا کرنا اُن کا فرض بھی ہے۔ لیکن حقیقی سوال یہ ہیں کہ حکومتیں حقیقی مفاد کا فیصلہ صحیح طور پر کس حد تک کرتی ہیں اور یہ کہ جو مقاصد وہ مقرر کرتی ہیں ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان کے اقدامات دانشمندانہ کہاں تک ہوتے ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تمہارے حقیقی مفاد کیا ہیں اور انھیں حاصل کس طرح کرنا چاہیئے سیاسی بصیرت سے کہیں زیادہ اخلاقی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے ایک جمہوری ملک کی خارجہ پالیسی بہت بڑی حد تک ساری قوم کی اخلاقی بصیرت کا نتیجہ اور اس کی آزمائش ہوتی ہے۔

عمل کے دوسرے میدانوں کی طرح بین الاقوامی امور میں درست فیصلے اور اخلاقی ملحوظات کے فیصلہ کن تعلق پر زور دینے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمام سیاسی اور ڈپلومیٹک سوالوں کو حق اور باطل کا مسئلہ سمجھ لیا جائے۔ مسائل کے متعلق اخلاقی انداز نظر کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ ہم ان پران سادہ اصطلاحوں میں غور کرنے لگیں کہ وہ نیکی کے لئے چیلنج ہیں۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ ہمیں ہر چیز یا تو بالکل سیاہ نظر آئے گی یا بالکل سفید۔

واقعہ یہ ہے کہ سچائی اس کے برعکس ہے۔ واقعات کا عام رنگ سفیدی مائل سیاہ یا سیاہی مائل سفید ہوتا ہے۔ اس اعتراف کا نتیجہ حلم اور رواداری ہونا چاہیئے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پچاس سالہ کنووکیشن میں پروفیسر بینٹ نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اس سلسلے میں کچھ دانشمندانہ باتیں کہی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا:

" گذشتہ چند برسوں میں دنیا کے ان حصوں میں جہاں سیاسی طور پر مقتدر

تحفظ کریں اور اس سے مختلف قسم کی اقدار کے خلاف جنگ، مقدمات اور
سزاؤں کی آندھی چلتی رہی ہے۔ ان تمام کارروائیوں میں سب سے زیادہ ہولناک

- چیز یہ مفروضہ رہا ہے کہ ایک انسان ہمیشہ برحق ہوتا ہے۔ اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ یہ عدم رواداری ایک ایسی گستاخانہ لاف زنی اور دیدہ دلیری ہے جسے یونانیوں نے بنیادی گناہ قرار دیا تھا، ایک ایسا گناہ جو اخلاقی خودکشی کے مترادف ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ گناہ فطرت اور انسانی فطرت سے بلند تر قوت کی پرستش کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے اور کسی انسان، اقتصادی اکائی، سیاسی پارٹی یا قومی ریاست کو دیوتا بنا کر پوجنے کی بھی"

دیدہ دلیرانہ ریاکاری اور اپنے آپ کو آدم بیزارانہ دلجمعی کے ساتھ اخلاقی طور پہ برتر سمجھنے کی روش خواہ وہ فرد میں ہو خواہ قوم میں، قابل ستائش عادات ہرگز نہیں اور وہ صحیح سیاسی فیصلے کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس میں انکسار اور اخلاقی حس کی نشو و نما بہت کم ہوئی ہو، حقیقت اور مصلحت کو اصولوں کے ساتھ غلط ملط کرنے کا امکان کہیں زیادہ ہے، وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے نقطۂ نگاہ کو غیر شعوری طور پر مقصدِ نیکی کے مترادف قرار دے سکتا ہے۔



مزید برآں بین الاقوامی معاملات میں اپنے آپ کو مبنی بر نیکی سمجھنے کی روش کا نتیجہ فکر کے کٹر پن اور دوسرے نقطہ ہائے نگاہ کے ساتھ عدم رواداری کی شکل میں بھی رونما ہو سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال پیچیدہ اور ہر لمحہ تبدیل ہونے والے واقعات کو دانشمندانہ طور پہ سمجھنے میں حائل ہوتی ہے اور ڈپلومیسی کو غلام اور بے لچک بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

اس وقت تک ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں انھیں امن کی طرف ایک حقیقی پیشقدمی

دانشمندانہ معاملہ فہمی کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی بصیرت سے دست بردار ہوئے بغیر محتاط اور دُور اندیش رہنے کی ضرورت ہے۔ پردھان آرزن ہاورنے اس بات کو بہت اچھے اور جامع الفاظ میں ادا کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے پاؤں دھرتی پر رکھنے چاہئیں اور دماغ ستاروں میں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا آسان نہیں۔ یہ بات ہرگز آسان نہیں کہ آدمی اپنے پاؤں دھرتی پر رکھے اور وہ کیچڑ میں نہ دھنسیں اور اسی طرح یہ بھی مشکل ہے کہ آدمی اپنا دماغ ستاروں میں رکھے اور یہ دماغ ستاروں کے ماحول میں بے مقصدانہ گھومنا شروع نہ کر دے۔

جہاں ہمیں صحیح قسم کے امن کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھانا چاہیئے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے وہاں ہمارے لئے یہ احتیاط برتنا بھی ضروری ہے کہ ہم ان کوششوں کے دوران اپنی تحفظاتی قوت کو قبل از وقت کمزور نہ کر دیں اور اس نگرانی کو دوبھر نہ سمجھنے لگیں۔ جو آزادی کی قیمت کا لازمی حصہ ہے۔ پوپ پیوس نے ۱۹۵۲ء میں ایسٹر کا پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:

• بیزاری سب سے بڑا خطرہ ہے جو آج نیکی کو لاحق ہے۔"

دُنیا ابھی تک بیزاری اور اُکتائے ہوئے لوگوں کے لئے بھی اتنی ہی غیر محفوظ ہے جتنی کمزوروں اور غیر محتاط لوگوں کے لئے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ بصیرت کے بغیر قوت اور ہوشیاری بنجر اور بے سُود ہیں۔ کسی بھی شخص کے لئے جس نے ہمارے ورثے کی قیمتی روایات میں پرورش حاصل کی ہے، یہ بدیہی حقیقت سمجھنا آسان ہے کہ ہر سیاسی اور سماجی تحریک کی حقیقی قوتِ متحرکہ ہمیشہ بصیرت رہی ہے۔

جب سماجیں انتشار کا شکار ہوتی ہیں جیسا کہ یورپ اور ایشیا کی متعدد سماجیں گذشتہ چالیس سال میں کلیت کے جبر کی وجہ سے ہو چکی ہیں تو اس حادثے کی حقیقی توضیح وہی ہے جس کی

نہیں ہوتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہم اسے صرف ایک اخلاقی درس سمجھ کر ضرورت اور درخورِ اعتنا نہ سمجھیں لیکن درحقیقت یہ ایک ٹھوس سیاسی قول ہے اور اسے اسی حیثیت سے تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

اگر یہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری تہذیب کو جس سب سے بڑے خطرے کا سامنا ہے وہ خارجی نہیں داخلی ہے۔ پروفیسر ہالے نے اپنی حالیہ کتاب "تہذیب اور خارجہ پالیسی" میں اس بات کو بہت اچھے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"اگر ہماری تہذیب اُس بصیرت پر پوری طرح قائم رہی جس پر اس کا انحصار ہے تو کمیونزم کا نظریاتی چیلنج صرف خیالی ثابت ہوگا۔ یہ اس سے زیادہ خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا جتنی دیمک زندہ لکڑی کے لئے۔ ہماری تہذیب کو خطرہ آج داخلی طور پر درپیش ہے جو بصیرت کے ضعف سے پیدا ہوا ہے"

میرے خیال میں یہ بات صاف ہے کہ اس صدی کی پہلی چار دہائیوں میں مغربی سماج کی بصیرت میں واقعی ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے نتائج ہر اُس شخص پر بخوبی ظاہر ہیں جس نے اِس دَور کی تاریخ پر ایماندارانہ غور کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔

لیکن ہماری تہذیب کی عمیق ترین روایت یہ ہے کہ ہم تجدیدیت اور مثبت اور تخلیقی ردِّ عمل کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ اب رُجحان بدل گیا ہو، اور آدمی خواہ غیر ثابت قدمی سے ہی سہی، ظہورِ ثانی کی طرف قدم بڑھا رہا ہو۔ اگرچہ غیر ثابت قدمی ایک ایسی چیز ہے جس کے ہم اِس جوہری دَور میں ہرگز روادار نہیں ہو سکتے۔ لیکن میرے خیال میں یہ یاد کرنا غیر مناسب نہیں کہ گزشتہ چند سال میں جمہوری سماج کے اندر ترقّی مجموعی طور پر صحیح سمت ہی میں ہوئی ہے۔

اگر آج ہم قدرے محتاط رجائیّت میں حق بجانب ہیں تو اس کی ایک وجہ میرے خیال میں

خود یہ ہے کہ جن خطروں کا ہمیں سامنا ہے وہ واقعی بہت ... [illegible]

بیرونی خطروں کا ایک فائدہ جسے کوئی بھی اچھا مورخ تسلیم کرے گا یہ ہے کہ وہ تعمیری ردِ عمل کے محرّک ثابت ہوتے ہیں، وہ ایسی کوششوں اور سرگرمیوں کو بروئے کار لاتے ہیں جو مستحسن تو ہر حال میں تھیں لیکن بیرونی دباؤ کے بغیر لوگ اپنے تساہل یا کوتاہ نظری کی وجہ سے ان پہ آمادہ نہ ہوتے۔ اس قسم کے بیرونی دباؤ بعض اوقات بعد میں مفید اور قابلِ قدر بھی تسلیم کر لئے جاتے ہیں کیونکہ وہ تعاون کی ایسی عادات اور اداروں کی نشو و نما کا باعث بنتے ہیں جو ان خطروں کی مغلوبیت اور تباہی کے بعد بھی جو ان کا محرّک ثابت ہوئے تھے مدّتوں تک قوموں کی زندگی اور نشو و نما کا موجب بنے رہتے ہیں۔

اس تعمیری ردِ عمل کی ایک مثال ۱۷۷۶ء میں تیرہ امریکی نو آبادیوں کی یونین کا قیام ہے جو برطانیہ کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ایک اور مثال اس سے ایک صدی بعد کنیڈا کی نو آبادیوں کے وفاق کا قیام ہے۔ یہ بھی کافی حد تک اس خطرے کا نتیجہ تھا جو ہمارے قوی دکنی پڑوسیوں کی توسیعی سرگرمیوں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ پڑوسی اس وقت تک برِ اعظمی سطح پر "تقدیرِ شدنی" کے تصوّر سے سرشار نظر آتے تھے۔

کچھ حالیہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ۱۹۴۵ء کے بعد مغربی یورپ کے جمہوری ملکوں کی تعمیرِ جدید میں امریکہ نے جو اقتصادی امداد کی ہے وہ ہر حالت میں مستحسن تھی۔ لیکن مشرقی یورپ میں سوویٹ سامراج کا خطرہ نہ ہوتا تو یہ بات ممکن تھی کہ یہ مدد مناسب اور موزوں حد تک نہ ملتی۔

نارتھ اٹلانٹک پیکٹ کے ملکوں میں زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس خطرے کی وجہ سے آپس میں مشورہ کرنے کی جو عادتیں رواج پا رہی ہیں ان میں مغرب کی عیسائی دنیا کی اخوت کے قدیم احساس میں از سرِ نو روح پھونکنے کا جو رجحان ہے اس کا پتہ چلانے کے لئے کسی غیر معمولی خیال آرائی کی ضرورت نہیں۔ یہ چیزیں موجودہ نسل کی تحفّظاتی ضرورتیں ختم ہونے کے بعد بھی

اسی طرح تہذیبوں کے درمیان تعاون جس میں مؤثر اقتصادی اور ٹیکنیکل مدد بھی شامل ہے اگرچہ بذاتِ خود بھی مستحسن ہے لیکن بیرونی خطرے کے احساس نے اس تعاون کا حصول آسان تر ضرور بنا دیا ہے۔ اگر ہم موجودہ کشمکش سے بچ نکلے تو میرے خیال میں یہ بات ناقابلِ تصوّر ہرگز نہیں کہ جو رابطے اب جبرِ حالات کے تحت قائم ہو رہے ہیں وہ ان بیرونی محرکات کی پسپائی اور خاتمے کے بعد بھی بار آور اور مفید ثابت ہوتے رہیں۔

لیکن اس بات کو میں پھر دُہراتا ہوں کہ سب سے زیادہ اہم عنصر داخلی ردّعمل ہے کیونکہ ایک صحت مند سماج کا انحصار بنیادی طور پر داخلی اُمور پر ہوتا ہے اور کسی تہذیب کے بنیادی اوصاف اس کے ادارے نہیں بلکہ اس کے افراد کے محسوس کرنے اور سوچنے کے طریقے ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ کسی قوم کے افراد کس [illegible] تکمیل سمجھتے ہیں۔

زندگی نے انسانوں کو ہمیشہ ان دو بنیادی سوالوں سے دوچار کیا ہے۔ کیا کیا جائے؟ اور جو کچھ کرنا ہے اُسے کس طریقے پر انجام دیا جائے؟ مقاصد اور ذرائع کا یہ سوال مدّتِ مدید سے چلا آتا ہے۔ اس کے دونوں حصّے ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور جب کبھی کسی قوم نے مقصد کے انتخاب پر طریقوں کو ترجیح دی ہے تو اس کا نتیجہ انتشار کی صورت میں رونما ہوا ہے۔

"کیسے کیا جائے؟" کا مسئلہ بہرحال ایک ٹیکنیکل مسئلہ ہے اور سماجی سائنس کے سوا باقی تمام ٹیکنیکل میدانوں میں مغرب نے گذشتہ نصف صدی میں اس سوال کے بہت کامیاب اور مؤثر جواب پیدا کئے ہیں۔ یہ بات کئی بار واقعی کہی جاتی ہے کہ ہمارے بیشتر سیاسی اور اقتصادی مسائل کا علاج یہ ہے کہ سماجی سائنسوں کے پیچھے بھی اسی سرگرمی اور تصوّر کی کارفرمائی ہو جن کی بدولت قدرتی سائنس کے میدان میں اتنی شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

لیکن میرے خیال میں یہاں ضرورت اس سے کہیں زیادہ کی ہے۔ زیادہ حقیقی ضرورت یہ ہے کہ مقاصد کے بنیادی سوال پر ذرائع کے مقابلے میں بہتر توجّہ دی جائے۔ بنیادی سوال یہ ہے

یہاں ہم اقدار کے تقلیدی [illegible] ہیں جہاں ذہن کے تقاضے [illegible] اور
ذرائع کے مقابلے میں مقصد کی پسند پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہاں جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ بصیرت ہے، ایک ایسی بصیرت جو حقیقت کے ٹھوس ادراک کے ہمرکاب ہو۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ چل سکتی ہیں اور انھیں چلنا چاہیئے۔

سچا حقیقت پسند وہ ہے جو کسی چیز کو دونوں زاویوں سے دیکھ سکتا ہے، اس کی موجودہ شکل کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہر صورتِ حال میں اصلاح کے امکانات ہوتے ہیں اور ہر زندگی میں بہتر بننے کی صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ صحیح حقیقت پسندی میں دونوں باتیں شامل ہوتی ہیں، بصارت بھی اور بصیرت بھی۔ صورتِ حال کے نصف پہلوؤں کو دیکھنا، صرف یہ دیکھنا، کہ واقعات کی موجودہ شکل کیا ہے اور یا صرف یہ دیکھنا کہ اس میں تبدیلی کا کہاں تک امکان ہے، حقیقت پسندی نہیں بلکہ آنکھوں پر اندھیاری لگا لینے کے مترادف ہے۔ نظر کے ان دونوں زاویوں میں ثانی الذکر نسبتاً کمیاب بھی ہے اور زیادہ اہم بھی ہے۔ بہر حال بات تبھی بنتی ہے جب یہ دونوں موجود ہوں اور دونوں ہی کی ہمیں ضرورت ہے

یہ بُنیادی اصول انسان کے تمام بڑے بڑے ادیان میں موجود ہے کہ اقدار کا وجود معروضی ہوتا ہے۔ اقدار ایک عالمگیر اور مکمل حقیقت کے مظاہر ہیں۔ اس اعتراف نے کہ کوئی شخص ان اقدار کا تصوّر جزوًا ہی کر سکتا ہے، انھیں کسی معاملے میں جزوًا ہی عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور کسی قانون یا فن پارے میں ان کا صرف عارضی اظہار ہی ہوتا ہے، ہمیں رواداری اور معاملہ فہمی کی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے یا کم سے کم یہ احساس اُسے دلانا ضرور چاہیئے۔

لیکن جب کسی معاشرت کو زنگ لگ جاتا ہے تو رواداری کے ان اوصاف پر بے اعتنائی غالب آجاتی ہے جو اس کا ہلانہ مفروضے کی شکل اختیار کر تی ہے کہ کسی ایک نقطۂ نظر، کسی ایک مذاق یا کسی ایک ردِّ عمل میں اور باقیوں میں کوئی فرق نہیں اور اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ
[illegible]

کیونکہ یہ نشو و نما اور صحت مندانہ ترقی کی جڑوں پر ہی ضرب لگاتی ہے۔

بہر حال میں ان لیکچروں کو مایوسی اور یاس کے نقطے پر ختم کرنے کا آرزو مند ہرگز نہیں۔ لہٰذا میں پھر وہیں لوٹتا ہوں جہاں سے میں نے شروع کیا تھا۔ میں نے ابتدا تاریخ سے کی تھی جو ہماری تشویشوں اور موجودہ بے اطمینانیوں کا موزوں تدارک ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگرچہ ان دنوں دانشمندی اور عزم کی بڑی سخت ضرورت ہے لیکن شکست خوردگی اور مایوسی کی کوئی وجہ ہرگز موجود نہیں۔

دوسرے انسانوں کے ساتھ پُر امن زندگی بسر کرنے میں ناکامی کے بھیانک نتائج اور ماضی کی افسوسناک یادوں سے دوچار ہو کر آدمی نے اس انجامِ بد کی پیشین گوئیوں کو کئی بار ناگزیر تصور کر لیا ہے جس سے وہ کبھی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب رہا ہے۔ مستقبل کے متعلق مایوسانہ قیاس آرائی اور سچ تو یہ ہے کہ ہر قسم کی قیاس آرائی ہمیشہ ایک خطرناک ذہنی مشغلہ ہوتا ہے اٹھارویں صدی میں جب سلطنتِ برطانیہ کے عظیم دور کا آغاز ہونے والا تھا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ زوال کی ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں سے اُسے بچا لانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ولیم ولبر فورس نے ۱۷۹۰ء میں کہا تھا "میں اس مستقبل سے تعلق قائم کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا جو اتنا تاریک اور غیر یقینی ہے۔" بیس سال بعد جب نپولین کا نیا نظام واٹر لو کے میدان میں شکست انجام ہو چکا تھا اور بوڑھا نگہبان موت کی وادی میں پہنچ چکا تھا تو بعد کے انتشار اور بے چینی کی بنا پر بہت سے لوگ بظاہر یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ صورتِ حال مغرب پر زار کے ماسکوی غولوں کے مکمل طور پر غالب آ جانے کا دیباچہ ہے۔ اس وقت ان غولوں کی موجودگی نے مغربی یورپ کے باشندوں کے دل میں وہی جذبات پیدا کئے تھے جن کی بازگشت ان دنوں عام ہے لیکن صرف چند ہی سال بعد قازق ڈان تک لوٹ گئے تھے اور یورپ کو اپنی نجات کے لئے ایک اور کوشش کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ تقریباً تیس سال بعد سکون و اطمینان کے اس قابل

نے اپنے بسترِ مرگ پر گہرا سانس لے کر کہا تھا: "خدا کا شکر ہے کہ میں اس تباہی سے بچ نکلا ہوں جو ہمارے گرد مجتمع ہو رہی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ موت اور تباہی کے خطرے کا جب بھی کبھی سامنا ہوا ہے تو اس نے آزاد انسانوں میں ہمیشہ یہ ردّ عمل پیدا کیا ہے کہ "ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" اس ردِ عمل سے انسان نے موت اور تباہی سے صرف اپنے آپ کو محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے مستقبل کو بھی یقینی بنا لیا ہے — خدا کرے کہ اِس مرتبہ بھی جب ہمیں جوہری دَور کے خوفناک اور پُر شکوہ دَور کا سامنا ہے، ایسا ہی ہو۔